فروری ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- حرفِ اوّل —— ۲
  عاکف سعید
- حکم و عبر —— ۴
  جسدِ ملی کے ناسور فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں —— مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
- ہدایت القرآن (۱۲) —— ۱۳
  مولانا محمد تقی امینی
- درسِ قرآن —— ۱۹
  سورۂ محمدؐ (قسط نمبر ۵) —— ڈاکٹر اسرار احمد
- دعوت رجوع الی القرآن (۲) —— ۳۵
  اسلام: برعظیم پاک و ہند میں —— ڈاکٹر اسرار احمد
- منشورِ اسلام (۱) —— ۴۹
  ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- حکمتِ اقبال (۲) —— ۵۹
  ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- تبادلۂ خیال —— ۷۰
  جناب گلزار احمد کا مکتوب اور مولانا اخلاق حسین قاسمی کا جواب

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اعلیٰ	اشاعت عام
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	6.00	2.00
راہ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00	2.00
قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	10	
مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	12.00	
قرآن اور امن عالم	2.50	
دعوت الی اللہ	2.00	
رسول کامل ﷺ	6.00	
نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت	5.00	3.00
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	4.00	
معراج النبی ﷺ	3.00	
شہید مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ)	5.00	2.00
سانحہ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	4.00	2.00
اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام	2.00	
اسلام میں عورت کا مقام	8.00	5.00
عظمت صوم	2.00	
عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	4.00	
اسلام اور پاکستان	5.00	
استحکام پاکستان	30.00 20.00	
علامہ اقبال اور ہم	3.00	
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک	4.00	
اسلام کا معاشی نظام	6.00	
دعوت رجوع الی القرآن		

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۶ | فروری ۱۹۸۶ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ | شمارہ ۲

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بحری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

دسمبر ۸۶ء کے "حکمتِ قرآن" میں "اسلامی تحقیق" کے موضوع پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کا ایک نہایت قیمتی مفصّل مقالہ قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اُس مقالے کا حاصل یہ تھا ——— کہ مغرب کے غلط فلسفیانہ نظریات (مثلاً سیکولرزم، فرائڈزم، ایڈلرزم، ہیگلزم اور مارکسزم وغیرہ) جو اس وقت پوری نوعِ انسانی پر مسلط ہو چکے ہیں، اسلام کو ایک زبردست علمی چیلنج دے رہے ہیں اور جب تک مسلمان اس چیلنج کا مُسکت جواب نہیں دیتے اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لئے راستہ صاف نہیں ہو سکتا اور مسلمان قیادتِ اقوام کے اُس منصب کی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جو خدا نے اپنے ان ارشادات میں ان کو سونپا ہے کہ تم دُنیا کی بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے (سُورہ آلِ عمران: آیت ۱۱۰) اور تم کو تاریخِ انسانی کے درمیانی دور میں پیدا کیا گیا ہے تاکہ ایک طرف تم خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے تمام گزشتہ انبیاء کی تعلیمات کے کمال کے حاملین قرار پاؤ اور دوسری طرف اپنے اس امتیاز کی بنا پر آنے والی انسانی نسلوں کے لئے اسی طرح کامیاب راہ نما ہو جس طرح رسول تمہارا راہ نما بنا ہے (سورہ بقرہ: آیت ۱۴۳)

ان نظریات کا کافی اور شافی جواب اس لئے بھی ضروری ہے کہ خود مسلمان ان سے مرعُوب ہو رہے ہیں اور خدا کے دین پر اُن کا اعتقاد مضمحل ہو رہا ہے اور اس طرح سے یقین و ایمان کی وہ بنیاد ہی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس پر خدا نے نوعِ انسانی کی راہ نمائی کا دار و مدار رکھا ہے، یعنی اُمّتِ مسلمہ کا ایمان۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحُوم نے اپنی اس تحریک پر سب سے پہلے خود عمل کیا۔

اس سلسلے میں انکی بنیادی کتاب انگریزی میں ہے جس کا نام "مستقبل کا نظریۂ حیات" (IDEOLOGY OF THE FUTURE) ہے جو آج سے تقریباً چالیس سال پہلے

لکھی گئی تھی - اس کتاب کا استدلال مغرب کے فلسفیانہ نظریات کی تردید ہی نہیں کرتا بلکہ "لیحق الحق و یبطل الباطل" کے مصداق، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے پڑھنے والوں کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ فطرت انسانی کے بے پناہ اور لازوال قوانین کے عمل سے جو نظریۂ حیات بالآخر پوری دُنیا میں پھیل کر رہے گا وہ اسلام کے سوائے کوئی اور نہیں ایک نامور مغربی فلسفی ڈاکٹر للی (Dr. W. LILLY) کی رائے کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں میکڈوگل، فرائڈ اور ایڈلر کے نظریات کا آخری (FINAL) جواب لکھ دیا ہے - ڈاکٹر صاحب کو اس کتاب پر پنجاب یونیورسٹی نے مغرب کے سربرآوردہ فلسفیوں کی سفارش پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تھی - اگرچہ للی کے خیال میں اس کتاب کا علمی معیار ان کتابوں سے کہیں بلند تر ہے جن کے لئے اس کی معلومات کے مطابق یورپ یا ہندوستان میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی گئی ہیں - اس کتاب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کے ایک باب کی مزید توسیع کر کے ایک اور کتاب لکھی جس کا نام "تعلیم کے ابتدائی اصول" (FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION) ہے اس کتاب میں انہوں نے مغرب کے عظیم تعلیمی فلسفیوں مثلاً ڈیوی، سر پرسی من اور جیمز راس کے تعلیمی نظریات کی تردید کی اور اس کے ساتھ ہی اسلام کا ایک مثبت تعلیمی فلسفہ بھی پیش کیا، اس کتاب پر ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ کی ڈی لٹ کی ڈگری ملی تھی جو سب سے اونچی ڈگری سمجھی جاتی ہے -

ہمارا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی بنیادی کتاب "مستقبل کا نظریۂ حیات" مغرب کے نظریات کا مؤثر علمی جواب ہے اور آئندہ ماضی اور مستقبل کے باطل نظریات کی تردید میں جو شخص بھی کچھ لکھنے کی کوشش کرے گا وہ اس کتاب کی قائم کی ہوئی بنیادوں کو نظر انداز نہیں کر سکے گا - لہٰذا ہر ممکن طریق سے ڈاکٹر صاحب کی کتاب کی عالمگیر اشاعت کرنا ایک اہم دینی فریضہ ہے

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا انداز بیان سراسر فلسفیانہ ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے قرآن اور حدیث کے حوالوں کے ساتھ اس کتاب کا ایک ڈیڑھ سو صفحہ کا اختصار بھی تحریر فرمایا تھا جس کا عنوان ہے "منشور اسلام" یعنی "اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریۂ زندگی

(باقی صـ۷۲ پر)

حکم و عبر

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

جسدِ ملّی کے ناسور

فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں

حضرت الامام الشاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالےٰ ایسے دیدہ ور اور صاحبِ نظر انسان تھے کہ ایسے انسان صدیوں میں ہی کبھی پیدا ہوتے ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ "دیدہ ور" جس وقت پیدا ہوا، اُس وقت برِ عظیم کی عظیم مغل حکومت کھوکھلی ہو چکی تھی اور کہنا چاہیئے کہ اسے گھن لگ چکا تھا اور اس کا دور واپسیں تھا۔

شاہ صاحب حالات کے پیشِ نظر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وسیع تر حکمت کے پیشِ نظر حرمین شریفین چلے گئے جہاں انہیں حج بیت اللہ کی سعادت کے ساتھ ساتھ حرم مدنی میں حضور خاتم النبیین و المعصومین محمد عربی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ و السلام کی مسجد اور گویا آپؐ کے "روبرو" بیٹھ کر آپؐ پر نازل ہونے والی کتابِ مقدس اور آپؐ کے فرمودات پر غور کرنے کا موقع ملا۔ جب کہ حرمین شریفین کے گرامی قدر اساتذہ اور اصحابِ علم سے آپ نے کسبِ فیض بھی کیا۔

ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ یہ ہندی نوجوان ہم سے الفاظ لیتا ہے اور ہمیں معانی و مفاہیم سے نوازتا ہے۔ شاہ صاحب اُس وقت تک حرمین شریفین میں رہے جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اُس کے بعد اُن کی واپسی ہوئی ـــــ نہیں بلکہ انہیں واپس کیا گیا۔

ایسا تاریخ میں بہت مرتبہ ہُوا کہ بعض افراد کو وہاں سے واپسی کا حکم ہُوا ۔ مثلاً ماضی قریب میں بپا ہونے والی عظیم تبلیغی تحریک کے بانی حضرت الامام مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی مستقل قیام کے ارادہ سے وہاں گئے لیکن بار بار انہیں خواب میں واپسی کا حکم ہُوا اور کہا گیا کہ تم سے کام لیا جائے گا۔

مولانا منحنی وجود کے فرد تھے، زبان صاف نہ تھی، گھبراہٹ کا شکار ہو گئے لیکن اپنے علمی حلقہ کے ایک بزرگ مولانا سید احمد فیض آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ (برادر بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا السید حسین احمد مدنی قدس سرہ و بانی مدرسۃ العلوم الشرعیہ مدینہ منورہ) کے سامنے جب یہ بات رکھی تو انہوں نے فرمایا کہ:

"میاں واپس جاؤ، تمہیں کہا جا رہا ہے کہ تم سے کام لیا جائے گا۔ یہ تھوڑا کہا جا رہا ہے کہ تم جا کر کام کرو۔ کام لینے والے خود لے لیں گے۔"

اسی طرح راولپنڈی کے گاؤں گولڑہ کے مشہور صاحبِ علم بزرگ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم و مغفور کی بھی ایسی ہی خواہش تھی۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ جب وہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت الشیخ الامیر امداد اللہ مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کی "بزم عرفان" وہاں قائم تھی۔

پیر صاحب اس کے بادہ نوشوں میں شامل ہو کر حاجی صاحب کے خدام کی فہرست میں آ گئے اور ان سے اپنے عندیہ کا ذکر کیا کہ وہ یہاں مستقل قیام کے متمنی ہیں۔

حاجی صاحب نے غور و فکر کے بعد انہیں واپسی کا فرمایا۔ اور فرمایا پنجاب میں ایک بڑا فتنہ رونما ہونے والا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم سے کام لیں گے۔

پیر صاحب حضرت الشیخ کے حکم کی تعمیل میں واپس آ گئے اور پھر یہاں انہیں قادیانی نبی سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا۔ علاوہ دوسری خدمات کے، انہوں نے سیدنا مسیح عیسیٰ علیہ سلام اللہ تعالیٰ علیہ وصلاتہ کے رفع و حیات پر ایک عظیم الشان کتاب سپردِ قلم کی جو ہمارے مناظرانی لٹریچر میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ بھی معاملہ پیش آیا۔ وہ ان سب کے بڑے تھے اور ان سے پہلے انہیں وہاں سے واپسی کا حکم ہوا۔

واپسی پر انہوں نے مختلف حوالوں سے کام کیا۔ اور یہ بات بلا خوف تردید کہی

جا سکتی ہے کہ ان کی وفات کے بعد سے اب تک اس پورے خطہ میں "اصلاحِ احوال" کی غرض سے جو تحریک بپا ہوئی، اس میں انہی کے انفاس طیبہ کی گرمی کارفرما تھی۔

اُن کے دور سے بالکل متصل "تحریک اصلاح و جہاد" انہی کے فرزند گرامی حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالےٰ کی سرپرستی میں شروع ہوئی — شاہ عبدالعزیز ان رجالِ کار میں سے تھے جن پر "استاذ الاساتذہ" کے لفظ کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوتا ہے۔

تاریخ میں حضرت الامام ابوحنیفہ رحمہ، علامہ ابنِ نجیم، شاہ عبدالعزیز رحمہ اور مولانا محمود حسن (شیخ الہند) بجا طور پر اس لقب کے مستحق ہیں کہ ہر ایک کی حسنِ تربیت کے نتیجہ میں ایسی ایسی گرامی قدر شخصیات سامنے آئیں کہ ان میں سے ہر ایک آفتاب و ماہتاب کی مانند تھی۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اس تحریک اصلاح و جہاد کے سرپرست تھے تو امارت حضرت الامام السید احمد شہید البریلوی قدس اللہ سرہ العزیز کی تھی جو ظاہری علوم کے حوالہ سے تو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن جناب طالوت کو "بسطۃً فی العلم والجسم" کی نعمت سے نوازنے والے نے انہیں بھی ان حوالوں سے خوب خوب نوازا تھا حتیٰ کہ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی بڈھانوی، مجاہد فی سبیل اللہ مولانا اسمٰعیل شہید اور علمائے صادق پور سمیت لاتعداد اربابِ علم و بصیرت ان کے گھوڑے کی رکاب تھام کر ساتھ ساتھ بھاگنا اپنی سعادت خیال کرتے اور ان کے اشارۂ ابرو کی تعمیل میں ہی اپنی عظمت کا راز پاتے۔

آپ کی اقتدا میں اہلِ بصیرت کو نماز ادا کر کے جو "کیفیتِ حضوری" حاصل ہوتی، اُس کا تو ذکر ہی کیا — لوگ محسوس کرتے کہ صحیح نماز وہی ہے جو سید صاحب کی اقتدا میں ادا ہوئی۔

اس تحریک کے بعد ۱۸۵۷ء کی اجتماعی تحریک کی پُشت پر جن علماء کے فتاویٰ تھے اور جن علماء و مجاہدین کی محنت تھی، ان کی نسبت ولی اللّٰہی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جولانی ملی اور جو عزم و حوصلہ نصیب ہوا، وہ بھی شاہ صاحب کے نفس کی گرمی ہی کے سبب۔

اس کے بعد حالات کا رُخ تبدیل ہوتا ہے اور بہتر مستقبل کی غرض سے میدانِ

دعا کے بجائے تعلیم و تعلّم کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو دیوبند کی تحریک علمی سے لے کر علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ تک کی تحریکوں کے بانی اسی خانوادہ کے فیض یافتہ تھے اور ان کا سلسلۂ تلمذ و سند انہی بزرگوں سے وابستہ تھا۔

اور تاریخ کے قاضی کے اس فیصلہ کو چیلنج کرنا ممکن نہیں کہ انہی علمی تحاریک کی کاوشیں بالآخر حصولِ آزادی کا ذریعہ بنیں۔

تاہم یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد مسلمان قوم کا اجتماعی حال پتلا کیوں رہا اور اب تک برابر رو بہ تنزل کیوں ہے؟ تو ہمارے خیال میں اس کے مختلف اسباب ہیں۔

الف: ایک سبب وہ زخمہ اندازی ہے جو جعلی اور جھوٹی نبوّت کے حوالہ سے غاصب انگریز نے پیدا کی۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے ملّت کا ایک طبقہ (جدید تعلیم یافتہ حضرات) اسلام کی بنیادی تعلیمات کے معاملہ میں ذہنی انتشار کا شکار ہو گئے تو دوسرے طبقہ (قدیم تعلیم یافتہ حضرات) کو اس فتنہ کے دفاع میں اپنی بڑی صلاحیتیں صرف کرنا پڑیں۔ حتیٰ کہ حصولِ آزادی کے ۴۰ برس بعد بھی اس فتنہ کے برگ و بار پوری طرح ختم نہیں ہوئے۔ اس صورتِ حال کے نتیجہ میں بنیادی کام بُری طرح متاثر ہوئے اور اجتماعی انداز سے بہتر مستقبل کے لیے ہونے والی کاوشیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

ب: اُس دَور میں قادنیت کے علاوہ بعض اور ایسے علمی فتنے رونما ہوئے جن کے دفاع کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی حتیٰ کہ جب انگریز کے چل چلاؤ کا وقت آیا تو وہ فتنے خاصا حلقہ بنا چکے تھے اور انہوں نے بھی ملّت کی اجتماعی سوچ کو اچھا خاصا دھچکا لگایا۔

اس ضمن میں سنّت کی تشریعی حیثیت کو چیلنج کرنے والے اربابِ علم کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے ایک طرح اس مسلّمہ حقیقت کو نظر انداز کیا تو دوسری طرف ایک خاص موقع پر ملّت کے سوادِ اعظم کا ترجمان بن کر ذہنی انارکی کی فضا پیدا کی۔

تقسیمِ ملک کے بعد سے اب تک دستوری اور آئینی میدان میں دینی حوالہ سے جو طبقہ ایک بڑی رکاوٹ کا باعث بنا ہُوا ہے وہ یہی طبقہ ہے، کیونکہ اس نے جیسا کہ عرض کیا، تحریکِ پاکستان کے دَور میں سوادِ اعظم کی ترجمانی کا فرض ہاتھ میں لے کر یہاں

کی بوجوہ مؤثر قوتوں کو خاصا متاثر کیا ہے اور اس وجہ سے یہ رکاوٹ سدِ سکندری بن گئی ہے۔

ج : فرقہ واریت اور اس سے بڑھ کر تکفیر مسلمین کی بے ہودہ مہم نے غلامی کے زمانہ میں خاصے بال و پر نکالے اور تقسیم ملک کے بعد دھیرے دھیرے اس کے اثرات بڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ اب اس نے ایک عفریت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دھرتی پر جو گناہ ہوتے ہیں ان میں ایک بہت ہی زیادہ زہریلا گناہ "تکفیر مسلمین" ہے — حضور اقدس محمد عربی صلوات اللہ تعالےٰ علیہ وسلامہ نے اس کے بُرے انجام سے اس طرح متنبہ کیا کہ:

"جو شخص کسی کو کافر کہتا یا اس پر لعنت بھیجتا ہے اور اگلا اس کا مستحق نہیں تو اس کا وبال کہنے والے کی گردن پر ہو گا۔"

لیکن یہاں تو افراد سے بڑھ کر جماعت بلکہ پوری اُمت کو اس ناوک افگنی کا نشکار ہونا پڑا۔ انگریز، دورِ اقتدار میں اس کو ضرورت تھی کہ اس کا ظالمانہ اقتدار ہمیشہ قائم رہے۔

اِس مقصد کی غرض سے اُس نے جہاں "نبوّتِ کاذبہ" کا سہارا لیا وہاں ایسے "شمس العلماء، اعلیٰ حضرت، علّامہ اور سجّادگان طریقت" بھی ڈھونڈ نکالے جو اس ظالم کو حق بجانب ثابت کریں، اس کے دور کو امن کا دور قرار دیں، اُس دور کے ہندوستان کو دارالاسلام ثابت کریں، اس کے دورِ حکومت کے دوام و استحکام کے لیے دعائیں مانگیں۔ اور جہاد و تعلیم کے میدان میں اس سے مقابلہ کرنے والے "مردانِ راہِ حق" کو بد عقیدہ ثابت کر کے انہیں کفر و نفاق کے زہر آلود خنجروں سے زخمی کریں اور اس طرح سادہ لوح عوام کو ان کی پشت پر کھڑا ہو کر مقابلہ کرنے کی راہ سے روکیں — گویا صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ — کا کردار ادا کریں۔

دورِ غلامی میں "غلامانِ تقیہ" اور "آلِ ابنِ سبا" کا بھی ایک رول تھا — مغل ایمپائر، سراج الدولہ، اور سلطان ٹیپو کے خلاف اس طبقہ کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں تاریخ کا ایک المناک باب ہے — اس المناک باب پر تفصیلی گفتگو اللہ نے چاہا تو ہم آئندہ کسی وقت عرض کریں گے۔ اس وقت صرف اس طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اُس دَور میں اس طبقہ کے معتقدات اور تاریخی طرزِ عمل سے آنکھیں بند کر کے بعض دوائر میں اس کو

اپنی مجالس میں شامل رکھا گیا۔ حتیٰ کہ یہاں تک المیہ رونما ہُوا کہ مسلم سیاسیات کے بعض انتہائی نازک اور حساس معاملات اس طبقہ کے افراد کے ہاتھ چلے گئے اور تقسیم ملک کے بعد اسی طبقہ کے ایک انتہائی اہم فرد، جس کا تعلق ضلع جہلم سے تھا اور جو سفارت سے لے کر مرکزی وزارت تک کے مزے لوٹ رہا تھا نے ایک موقع پر یہ بڑ ہانک دی کہ اب اس ملک میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا قرآن کوئی نہ سُنے گا۔ اس پر مرحوم بخاری صاحب نے برجستہ کہا ؎

تبرائیو! اب تبرا کرو کہ اب وقتِ قرآن خوانی گیا
کرو کو بکو یا علی یا علی کہ اب ذکرِ اوّل و ثانی گیا

اب وہی طبقہ ہے جو ان مخصوص حالات اور پھر ایرانی انقلاب کے سبب آنکھیں دکھا رہا ہے اور حکومت سے لے کر مذہبی قیادت کی اکثریت خوشامدانہ رول ادا کرکے دینی غیرت کا جنازہ نکال رہی ہے۔

انہی عوامل نے مِل جُل کر حالات کی تصویر بگاڑی اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی جانشین مولانا محمد الیاس رحمہما اللہ تعالےٰ کے بقول :

" امت کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور اس قوم کے افراد کے اُمت بننے میں رکاوٹ پیدا کی یہ تمام طبقات صرف اس لیے سرگرمِ عمل تھے کہ یہاں انگریز کا اقتدار مستحکم رہے اور ایسی عادلانہ حکومت قائم نہ ہو سکے جس کے پیشِ نظر بڑے چھوٹے کے مفادات یکساں ہوں اور کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے۔

اِس خدمت کے صلہ اور نتیجہ میں ان لوگوں کو خطابات سے نوازا گیا۔ مربعے الاٹ ہوئے۔ دربار میں کرسی میسّر آئی۔ لیکن تا کجے !

انگریز کے ظالمانہ اقتدار کو کوئی چیز سہارا نہ دے سکی ـــ اس کی کشتی ڈوبی اور اس طرح کہ جس کے اقتدار کے متعلق کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ اُس کے حدودِ مملکت میں سورج نہیں ڈوبتا اب وہ ایک جزیرے میں بند ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ اس کے "یاران سرِ پل" اپنی سازشوں ریشہ دوانیوں اور لن ترانیوں کے ساتھ اب تک زندہ و پائندہ ہیں۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا سبب کچھ ایسا ہے کہ "سفید صاحب" نے بھاگ کر اقتدار کے سرچشمے "کالے صاحب" کے سپرد کرنے میں عافیت سمجھی تاکہ جن لوگوں کی پیہم قربانیوں

کے نتیجہ میں سونے کی چڑیا اُس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے، وہ پھر بھی محروم رہیں گے! اُس نے جاتے جاتے بھی بلا نوشان محبت سے انتقام لیا اور اپنے پیاروں کو نواز کر چلتا بنا۔

جب سفید صاحب کی تربیت یافتہ نسل برسرِ اقتدار آئی تو اس نے اپنے آقایانِ ولی نعمت کی مرتبہ فائلیں نکال کر اقتدار کے استحکام و دوام کے نسخے تلاش کیے تو بات اُس کی سمجھ میں آگئی اور اُس نے

الف : جھوٹے نبوّت کے پرچارکوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا حتیٰ کہ اہم کلیدی پوسٹیں انہیں دے دیں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے پہلے دن سے جنگی محاذ گرم رہا تاہم ۱۹۷۴ء میں ایک مرحلہ سر ہُوا اور وہ بھی بعض اس حد تک کہ انہیں کتاب و دستور میں جسدِ ملّت سے الگ کر دیا گیا۔ رہ گئے باقی معاملات تو ان کا حال جوں کا توں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی طرح جسدِ ملّت کو جونک بن کر چمٹے ہوئے ہیں۔

اِس محاذ پر ہوش، تدبّر اور خلوص سے کام کرنے والوں کا قافلہ لُٹ گیا اور راہی ملکِ بقا ہوگیا۔ اب ایک طرف حکمران ہیں جن کا خلوص سے دُور کا واسطہ نہیں تو دوسری طرف ان عظیم لوگوں کے "وارث" ہیں، جو اہلیت کی بنا پر کم اور دوسرے ذرائع سے زیادہ وارث بنے ہیں — خلوص کی تلاش مشکل، وہ اگر ہے تو ہوش و تدبّر ندارد، نتیجہ یہ ہے کہ پتے جھاڑنے اور ٹہنیوں کی اصلاح کی تو سب کو فکر ہے، اِس سے آگے کچھ نہیں۔

ہونا یہ چاہیئے تھا کہ مرزائی نبوّت اور مرزا کے خاندان کے مادی وسائل پر کاری ضرب لگائی جاتی — لیکن افسوس کہ ایسا نہیں — افسوس کہ آج چودھری افضل حق سے لے کر مولانا تاج محمود تک ایک ایسا نہیں جو ربوہ کے معاشی وسائل پر ایک خاندان اور اس کے لگے بندھوں کے مفادات کے خلاف آواز اُٹھائے۔

اگر غیر مسلم اوقاف میں یہاں کے وسائل شامل کر لیے جائیں اور ربوہ کی شہری پراپرٹی وہاں موجود آبادی کے سپرد کر دی جائے تو یہ فتنہ دم توڑ کر رہ جائے گا۔ لیکن اس کا شعور کسے ہو؟ بدقسمتی سے ہمارے یہاں غریب عوام کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اقتدار و سیاست کی دکان چمکانے کا رواج پڑ چکا ہے، اسی عافیت کے راستے کو مذہبی قیادت نے اپنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مسائل کا احساس نہیں۔

ب : سنّت کی تشریعی حیثیت کا انکار کرنے کے باوصف جو لوگ تحریکِ پاکستان کے حوالہ سے سوادِ اعظم کی صفوں میں گھُسے انہیں نکال باہر کیا جاتا اور انہیں ع ایاز قدرِ خود بشناس

کی نصیحت کی جاتی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ اقتدار سے لے کر اہلِ سیاست تک، سبھی نے محسوس کر لیا ہے کہ عافیت اسی میں ہے کہ سنت کی تشریعی حیثیت متنازعہ فیہ بنی رہی تاکہ اس طرح ہمارے اللّے تللّے چلتے رہیں۔

حیرت ہے کہ ایک عرصہ سے یہاں "لا الٰہ الا اللہ" کی رٹ بہت لگتی ہے لیکن "محمد رسول اللہ" کی بات بہت کم کی جاتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ اپنے محبوب کریم کا تذکرہ ہر جگہ رکھا تو ہمارے یہاں یہ سوانگ کیوں رچایا گیا کہ آدھے کلمہ پر اکتفا کر لیا گیا؟

شاید اس میں یہی راز ہے کہ نہ محمد کریم اور ان کی سنت کی بات ہوگی نہ ہی قرآن کی تشریح و ترجمانی کا مرحلہ آئے گا۔ اور اس طرح اسلام کی خدمت کے جھوٹے دعوؤں کے باوصف عملاً کچھ نہ ہو سکے گا۔

اے کاش! لوگوں کو خیال ہوتا کہ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوارج سے گفتگو کرنے کی غرض سے "حبر الامۃ"، "ترجمان القرآن" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھیجا تو اس سے منع فرمایا کہ قرآن کو درمیان میں نہ لانا۔

ح : فرقہ واریت کے عفریت کا سر کچلنے کے بجائے اسے بھی مزید پالا گیا کہ اس میں ہے — لڑاؤ اور حکومت کرو — کا راز اسی میں ہے، بلکہ اب تو سنتم یہ ہوا کہ جو لوگ انگریز کے اقتدار کے دور کے ہندوستان کو دارالاسلام کہتے، انہیں یہاں بھی پذیرائی حاصل ہوئی اور ہر جماعت و فرد پر فتوائے کفر لگانے والے اب مسلمانوں کے سب سے بڑے خادم قرار پائے اور جو شخص اس فتنہ کا بانی تھا اسے یہاں کے پریس اور ذرائع ابلاغ نے "امامت" کے منصب پر فائز کر دیا۔ معلوم نہیں کہ یہ حقائق کی کون سی قسم ہے اور اس کو کس کی خدمت قرار دیا جا رہا ہے؟

د : یہی "غلامانِ تقیہ" کا ہے کہ ان کی ہر غلط ادا کو بھی برداشت کیا جا رہا ہے اور ان کی فتنہ سامانیوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ ان کے معتقدات، تاریخی کردار اتنا واضح ہے کہ کسی رعایت کی گنجائش نہیں اور خود وطنِ عزیز میں ان کے ہاتھوں جو ہوا وہ سب سے بڑھ کر ان کی فسادی ذہنیت کا ثبوت ہے لیکن فیا حسرتا کہ پھر ان کی خوشامد!

سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح ہم سنبھل سکیں گے؟ ہمارے ادبار و تنزل کی رات ختم ہو جائے گی؟ معاشرے کو امن نصیب ہو جائے گا اور انسانیت کے دکھ دور ہو جائیں گے؟

ہمارا ایک ہی جواب ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔

بلکہ اصلاحِ احوال کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ اس مفکر و دانشور کی فکر میں غوطہ زن ہو کر ہوش و تدبر سے عمل کی راہیں استوار کی جائیں، جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا۔

اس کے قلم سے نکلے ہوئے ہزاروں صفحات میں سے ہر صفحہ بحمد اللہ محفوظ ہے، پاک و ہند سے کے مصر و حجاز تک ان کی اشاعت ہو رہی ہے، ان پر حواشی لکھے جا رہے ہیں۔ ان کی تشریحات میں کاغذ ہو رہے ہیں۔ اور ان کے مختلف زبانوں میں تراجم ہو رہے ہیں لیکن یہ تو صرف ان دانشوروں کی شوخیاں ہیں جو "لغت ہائے حجازی و غیر حجازی" کے "قارون" ہیں جنہیں لکھنا پڑھنا سب آتا ہے لیکن جو عمل کی قوت سے عاری ہیں۔

ایسے "قارون"، شوخیٔ گفتار کے امام ہوتے ہیں لیکن عمل کے میدان کے کھوٹے —— جب کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد

"میرے بھائی اپنی تمام صلاحیتیں علم پر ہی نہ خرچ کریں کچھ حصہ عمل کو بھی دیں۔"

عمل کے لیے امام ولی اللہ رح کی معرکۃ الآرا کتاب "تفہیمات الٰہیہ" کے جزو اوّل کی تفہیم ۶۶ کافی ہے۔ اس میں امام موصوف نے "اخلاقی زوال" پر بعض طبقات کے حوالہ سے بڑی خوبصورت گفتگو کی ہے اور بتلایا ہے کہ کس طرح مختلف طبقات اپنی غلط روی سے ملت کے زوال کا باعث بن رہے ہیں۔

انہوں نے اسلام کے دامنِ اتحاد کو تار تار کرنے والی قوتوں میں سب سے پہلے شیعہ و روافض کا شمار کیا اور پھر اس میں ہر اس طبقہ کو شامل کیا جو نئے علم کلام کا مدعی بن کر سامنے آتا ہے —— ان کے اس تجزیہ کو سامنے رکھ کر سوچیں کہ آج کی جھوٹی نبوت اور سنت کی تشریعی حیثیت کے منکر کیا نئے علم کلام کے دعوے دار نہیں اور باقی دو طبقات جن کا ہم نے ذکر کیا وہ ملت میں تفریق و انتشار کے مجرم نہیں؟

اگر یہ دونوں باتیں صحیح ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ اس جدت پسندی اور ذوق تفریق کو ٹھکانے لگانے کی کیا سبیل ہوئی؟

شاہ صاحب کا تجزیہ ہے کہ یہ چیزیں یعنی جدت پسندی اور انتشار و تفریق زوال پذیر قوموں کے من پسند اور محبوب مشغلے ہوتے ہیں۔ وہ آئے دن نئے شگوفے چھوڑنے میں ماہر ہوتی ہیں اور انتشار و تفریق سے انہیں گہری مناسبت حاصل ہوتی ہے۔ اور بقول

مولانا محمد تقی امینی

آخرت کا ثبوت

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً تا وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔

اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں[1] تو فرشتوں نے کہا، کیا آپ ایسے کو نائب بنانا چاہتے ہیں جو فساد پھیلائے اور خون بہائے[2] ہم تو آپ کی تعریف کرتے ہیں اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا بلاشبہ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو (اس کے بعد) اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، تم مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ فرشتوں نے کہا آپ کی ذات (ہر کمی و کوتاہی سے) پاک ہے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں علم دیا ہے[3] بے شک آپ بڑے علم والے اور اونچی سمجھ والے ہیں (پھر) فرمایا، اے آدم تم ان چیزوں کے نام انہیں بتا دو، جب آدم نے فرشتوں کو ان کے نام بتا دیئے تو فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ہی آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہوں[4] اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا[5]

○

[1] قرآن کی بنیادی تعلیم کے بعد اب انسان اور ہدایت کی ابتدائی تاریخ بیان کی جا رہی ہے تاکہ انسان کی فطرت سے اس کی مناسبت ظاہر ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ یہ تعلیم کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے اس کا سلسلہ جاری ہے۔

اس تاریخ میں سب سے پہلے انسان کے اوپر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ پھر اس کی

عظمت وبڑائی ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے بعد ابتدار کی چند ہدایتیں ذکر کی گئی ہیں۔ لیکن ان سب کو بیان کرنے میں وہی انداز اختیار کیا گیا ہے جو قرآن کا عام انداز ہے اور جس سے بات آسانی سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے وہ یہ کہ کسی اہم بات یا بڑی حقیقت کو واقعہ کے رنگ میں پیش کیا جائے یعنی اس کہنے کو کافی نہ سمجھا جائے کہ یہ بات اس طرح ہے یا یہ حقیقت ایسی ہے بلکہ بات اور حقیقت کو عملی شکل میں (پریکٹیکل کرکے) دکھا دیا جائے۔ قرآن کا یہ انداز اور اس کی فائدہ مندی نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کو بڑا دھوکا ہوتا ہے اور کبھی تو اصل بات یا اصل حقیقت ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

آیت میں انسان کا مقام ومرتبہ خلافت ونیابت سے ظاہر کیا گیا ہے جس کی بدولت اللہ کی مخلوقات میں اشرف وبرتر قرار پایا ان کی قیادت اس کے سپرد ہوئی اور بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا گیا۔ یہ خلافت ونیابت اللہ کی ہے یا انسان سے پہلے دنیا میں آباد کسی اور مخلوق کی ہے؟ خود اس آیت اور قرآن کی دوسری آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی خلافت ونیابت مراد ہے۔ اس بات کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں جن آباد تھے اور انسان ان کا خلیفہ ونائب ہے

دنیا کے موجودہ مذاہب ونظریات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں انسان کو اس بلندی سے دیکھا گیا ہو جس بلندی سے قرآن نے دیکھا ہے اگر جن کا خلیفہ ونائب انسان کو فرض کیا جائے تو اس میں انسان کی نہ وہ بلندی باقی رہتی ہے اور نہ اس کی خاص شرافت و فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ جن جن کاموں اور ذمہ داریوں میں یہ خلافت ونیابت ہے وہ اپنے وسیع مفہوم میں زمین کی آبادکاری اس کی تعمیر وترقی اس کا نظم وانتظام چلانے اور اللہ کا قانون اسمیں نافذ کرنے میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کام مختلف گوشوں اور مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو جس گوشہ میں اور جس سمت سے بھی تعمیری کام انجام دے گا وہ خلافت ونیابت کے فرائض ہی انجام دے گا۔ اس طرح خلافت ونیابت کا عہدہ کسی ایک فرد کے لئے خاص نہیں رہتا بلکہ پوری نسل انسانی کے لئے عام ہو جاتا ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی حیثیت ولیاقت کے مطابق اس عہدہ پر فائز قرار پاتا ہے۔ اور حضرت آدم اس وقت اپنی پوری نسل کی نمائندگی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح خلافت ونیابت کے کام بھی کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں رہتے ہیں بلکہ زمین کی آبادکاری اس کی تعمیر وترقی اس کا نظم وانتظام

چلانے اور اس میں اللہ کا قانون نافذ کرنے سبھی کو عام ہو جاتے ہیں۔

ہ انسان کی زندگی کے دو رُخ ہیں ایک طرف وہ خاک کا پتلا ہے۔ زمین سے اس کو بنایا گیا ہے۔ زمین ہی میں اس کی ضرورتوں کا بندوبست ہے اور پھر زمین ہی میں اس کو خلیفہ و نائب مقرر کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں لازمی طور سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے اور اپنی ذمّہ داریوں کے کام کرنے کے لئے زمین اور اس کی چیزوں کو استعمال کرے گا اور ان سے فائدہ اٹھائے گا جس سے آپس میں رسّہ کشی ہوگی اور فساد و خوں ریزی اور فساد و خون ریزی تک نوبت پہنچے گی فرشتوں نے اسی ایک رُخ کی ترجمانی کی ہے جس کی بنا پر انہوں نے انسان کی خون ریزی و فساد ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف انسان کی زندگی کا ایک اور رخ بھی ہے جس کی طرف اللہ نے فرشتوں کے جواب میں اشارہ فرمایا: (ہو سکتا ہے کہ اس کی طرف فرشتوں کی رسائی ابھی نہ ہوئی ہو) وہ یہ ہے:

اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ "(اس کے بارے میں) میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو"

یہ واقعہ ہے کہ اس دوسرے رُخ کا اظہار اس سے بہتر کسی اور طرح نہیں ہو سکتا ہے۔ اس جملہ میں بڑی جامعیت ہے۔ انسان کی ان تمام صلاحیتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو اللہ نے ابتدا ہی میں پیوست کر دی ہیں اور جو رفتہ رفتہ بعد میں ظاہر ہونے والی تھیں پھر اللہ نے خود ہی اس دوسرے رخ کے صرف ایک پہلو کی جھلک فرشتوں کو دکھا دی جو لیاقت ظاہر کرنے کے لئے کافی تھی یہ صرف انسان کے علم کی جھلک تھی۔

۳ہ یعنی اللہ نے آدم کو ایک ایسا علم دیا جو فرشتوں کے پاس نہ تھا قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام "علم بالاسماء" ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت میں مفسّرین کے بہت سے اقوال ہیں لیکن زیادہ مناسب بخاریؒ کی وہ روایت ہے جس میں علّمنی اسماء کل شیء[۱] ہے (اللہ نے آپ یعنی آدم کو ہر چیز کے نام سکھائے) ظاہر ہے کہ نام سکھانے میں صرف طوطا کی طرح نام کا رٹانا نہ رہا ہوگا اور سکھانے میں بھی تعلیم کا وہ طریقہ نہ ہوگا جو عام طور پر رائج ہوتا ہے بلکہ نام کی جو وضاحت مفسّرین نے کی ہے وہی حال کے مناسب ہے وہ یہ کہ نام (اسم) سے مراد کسی چیز کی ایسی پہچان ہے جس سے وہ پوری طرح سمجھ میں آجائے۔ اس میں چیز کی حقیقت اس کی خاصیت اس کی صفت اور

لہ بخاری ج ۲ کتاب التفسیر باب العلم آدم الاسما

اس سے متعلق جتنی باتیں ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ کام کا تعلق ان سب سے ہے صرف نام رٹا دینے سے نہ کوئی کام انجام پاتا ہے اور نہ اس سے کام کی لیاقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ لیاقت ہی فرشتوں کو دکھانا تھا۔

پھر سکھانے کے طریقہ میں ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز کے الگ الگ نام سکھائے گئے ہوں بلکہ استعداد پیدا کر دینا کافی ہے۔ پھر اس کے بعد جو چیز بھی پیش ہوئی ہو آدم نے اس کا نام بتا دیا ہو۔ جس طرح کسی فن میں استعداد پیدا ہو جانے کے بعد نہ اس فن کی ہر کتاب پڑھنا ضروری ہوتا ہے اور نہ اس سے متعلق ہر چیز کا الگ الگ نام ضروری بتانا ہوتا ہے۔ ان سب کے لئے صرف استعداد پیدا ہو جانے کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ البتہ استعداد اس درجہ کی ہونی چاہیئے کہ اس سے فنی اجتہاد کی صلاحیت ابھر آئے۔ اسی طرح اللہ نے آدم میں ہر چیز کے علم کی استعداد پیدا کر دی پھر اس کے بعد جو چیز بھی پیش کی گئی ہو انہوں نے اس کا نام بتا دیا ہو۔ استعداد پیدا کرنے کے لئے کسی لمبے چوڑے کورس کی ضرورت نہ تھی بلکہ اللہ کی صفتِ علم کا پرتو (سایہ) کافی تھا یعنی جب اللہ نے آدم پر اپنی صفتِ علم کا پرتو (سایہ) ڈالا تو ان میں علم کی استعداد آگئی پھر اسکے ذریعہ انہوں نے ہر چیز کے نام بتا دیئے اور فرشتوں نے دیکھ لیا کہ صفتِ علم کا پرتو ڈالنے کے بعد جب آدم کے علم کا یہ حال ہے تو اللہ کی اور صفتوں کا پرتو پڑنے کے بعد مختلف سمتوں میں اس کی صلاحیت کا کیا حال ہوگا۔ اور اس میں کس قدر خلافت و نیابت کی لیاقت پیدا ہو جائے گی۔

اللہ کی صفت علم کا "پرتو" (سایہ) ڈالنے سے انسان ہی میں یہ لیاقت ظاہر ہو سکتی تھی اگر یہ "پرتو" (سایہ) فرشتوں پر ڈالا جاتا تو ان میں یہ لیاقت نہ ظاہر ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے جس رخ کی ترجمانی کر کے کہا تھا کہ وہ (انسان) فساد و خونریزی کرے گا" دراصل اسی رُخ میں "پرتو" کو برداشت کرنے اور اس کا اثر دکھانے کی اہلیت موجود تھی۔ فرشتوں میں اس انداز کی یہ اہلیت نہ تھی کہ اس کا اثر دکھا سکے۔ اگر ان پر "پرتو" ڈالا بھی جاتا تو ان میں خلافت و نیابت کی لیاقت نہ ظاہر ہوتی۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "جس طرح "پرتو" ڈالنے سے انسان میں لیاقت پیدا ہو گئی تھی اسی طرح فرشتوں میں بھی پیدا ہو جاتی پھر خلافت و نیابت کے عہدہ کے لئے انسان کی کیا خصوصیت تھی فرشتے بھی اس پر مقرر ہو سکتے تھے"

علم کا یہ "پرتو" (سایہ) اور اللہ کی صفتوں کے دوسرے "پرتو" جو انسان پر ڈالے گئے وہ

سب نورانی تھے اور جن کے ذریعے زمینی قوت کے ساتھ آسمانی قوت کو ملایا گیا تھا۔ پھر ان دونوں قوتوں نے مل کر انسان میں صلاحیتوں کے کیا کیا کرشمے دکھائے! اور اس کی کس قسم کی نفسیات وجود میں آئی! اس کو کسی قدر سمجھنے کے لئے راقم کی کتاب "حکمت القرآن" کا مطالعہ مفید رہے گا[1] نورانی اور خاکی دونوں بنیادوں کو سامنے رکھ کر ہی انسان کے نفسیاتی مباحث کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے ورنہ انسان کا مطالعہ یک رُخا رہے گا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ خلافت و نیابت کی صلاحیت ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے انسان کی بے پناہ صلاحیتوں میں صرف صفتِ علم کو منتخب کیا اور اس سے فرشتوں نے بھی لیاقت کا اندازہ لگالیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس عہدہ کو سنبھالنے کے لئے فیصلہ کن حیثیت علم کو حاصل ہے عبادت کو نہیں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ عبادت بندوں کی صفت ہے اور علم اللہ کی صفت ہے جس کا انسان خلیفہ و نائب بنایا گیا ہے۔

۵ اوپر انسان میں خلافت و نیابت کی صلاحیت ثابت کرنے کے لئے اس کی علمی استعداد دکھائی گئی تھی اب اس کے سامنے فرشتوں کو جھکا کر اس کی عملی استعداد بھی دکھائی گئی۔ دونوں میں روئے سخن فرشتوں ہی کی طرف اس بنا پر ہے کہ زمین کی آبادکاری اس کی تعمیر و ترقی اس کا نظم و انتظام چلانے اور اللہ کا قانون نافذ کرنے میں قدم قدم پر ان کے تعاون کی ضرورت ہے۔ قرآن میں فرشتوں کے جو کام بتائے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کے تعاون کے بغیر انسان خلافت و نیابت کے کام میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ فرشتوں کو جھکانے کا کام آسمانی قوتوں کو شامل کرنے کے بعد انجام پایا جس سے انسان کی عملی استعداد کا بھرپور اندازہ ہوگیا اور جس کی نہایت جامع تعبیر دوسری جگہ اپنی روح پھونک دینے سے کی گئی ہے۔ ونفخت فیہ من روحی (حجر آیت ۲۹) (میں نے اپنی روح سے کچھ اس میں پھونک دیا) آسمانی قوتوں کو شامل کر دینا اپنی صفتوں کا پرتو (سایہ) ڈال دینا خاک کے پتلے میں نور کی آمیزش کر دینا اپنی روح سے کچھ پھونک دینا۔ یہ سب بظاہر ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں۔

سجدہ سے مراد یہاں شرعی سجدہ نہیں ہے کہ اس وقت تک نہ شریعت آئی تھی اور نہ اس کا نفاذ ہوا تھا بلکہ "سجدہ" جھکنے کے معنی میں ہے جس سے مراد فرشتوں اور انکی عملداری کی مخلوق کو تعاون

---

[1] یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔

پر آمادہ کرنا ہے۔ شیطان کا جھکنے سے انکار کرنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ انسان کے کاموں اور اس کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے میں ایک زبردست رکاوٹ (شیطان) موجود رہیگی جس سے قدم قدم پر انسان کو مقابلہ کرنا پڑے گا۔ خلافت و نیابت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جس طرح فرشتوں کا تعاون ضروری ہے اسی طرح رکاوٹ سے مقابلہ بھی ضروری ہے کہ یہ مقابلہ نہ معلوم کتنی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتا رہے گا اگر یہ مقابلہ نہ ہو تو انسان آگے بڑھنے کے پروگرام نہ جاری رکھ سکے گا اور ٹھٹھر کر رہ جائے گا۔ (جاری ہے)

بقیہ: حکم و عبر

شاہ صاحب جب ایسا ہو جائے تو پھر اس قوم کا اللہ حافظ ہے؟

اگر آج ہماری حالت و کیفیت ہے کہ ہم علم و دانش کے حوالے سے "کل جدید لذیذ" کے رسیا ہو چکے ہیں اور ہماری روح کی غذا تفرقہ و انتشار بن کر رہ گئے ہیں تو پھر ہمیں شاہ صاحب کے تجزیہ کے حوالے سے اپنے مستقبل کی بھیانک تصویر سامنے رکھنی چاہیئے۔ محض یہ خواہش کہ اللہ کرے ایسا نہ ہو — ایک خوبصورت خواہش ضرور ہے لیکن اس سے کسی کو کبھی فائدہ نہیں ہوا۔ فائدہ تب ہی ہوتا ہے جب انسان بیماری کو سمجھ کر اس کے علاج و اصلاح کی فکر کرے۔ افسوس کہ ہماری اس طرف توجہ نہیں۔

اے کاش کہ ہم اس ملک کی مؤثر قوتوں کو یہ بات سمجھا سکیں کہ جدت پسندی اور تفرقہ کا ذوق اس ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گا اور اس قوم کو بے نشان — اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات آگئی تو الحمد للہ — ورنہ . . . . . .

بقیہ: دعوت رجوع الی القرآن

کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سر نو قرآن حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا۔ اور اللہ کی رسی کے ساتھ امت مسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے اس قول کے مطابق کہ "لَا یُصْلِحُ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا" اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی — فَجَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔

درسِ قرآن

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۵)

از: ڈاکٹر اسرار احمد

(تیسرا درس)

ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمن / حافظ عاکف سعید

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا
ذٰلِكَ وَ لَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّیَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ
وَ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ○

صدق اللہ العظیم

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ

حضرات! اللہ کے نام سے اور اس کی نصرت و تائید کے بھروسہ پر دو جمعوں قبل ہم نے سورۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے سلسلۂ مطالعہ قرآن مجید کے ضمن میں آغاز کیا تھا۔ پہلی نشست میں ہم نے ازسرِ نو قرآن مجید کے مطالعہ کے ضمن میں بعض بنیادی و تعارفی امور کو تازہ کیا۔ اسی سلسلہ کی جو باتیں پہلی نشست میں بیان ہونے سے رہ گئی تھیں، ان کا دوسری نشست میں اختصار کے ساتھ بیان ہوا۔ ساتھ ہی اس سورت کا تاریخی پس منظر،

اس کا زمانۂ نزول، اس کے مخصوص اسلوب کے بارے میں بھی میں پچھلی دونوں نشستوں میں کچھ بنیادی باتیں عرض کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ہم نے اس سورۂ مبارکہ کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ تین ابتدائی آیات کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں۔ میں ان آیات کے مباحث و مضامین کا اس وقت تک اعادہ نہیں کروں گا۔ البتہ دو باتیں جو بیان ہونے سے رہ گئی تھیں انہیں میں باقاعدہ مطالعہ سے قبل پیش کر رہا ہوں۔

حضورؐ کا اسمِ گرامی نام نامی

پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک محمدؐ — صلی اللہ علیہ وسلم — قرآن مجید میں کل چار مقامات پر آیا ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ جو اس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ہے وہ تو آپؐ کے نام نامی ہی سے معنون ہے۔ بقیہ تین مقامات میں سے ایک مقام اس سورۃ سے اگلی سورت یعنی سورۃ الفتح ہے۔ اس اعتبار سے بھی ان دونوں سورتوں کے جوڑا ہونے کی حیثیت اور نمایاں ہو گئی — اور اس خاص پہلو سے اس جوڑے کی ایک خصوصی اہمیت ہو گئی — باقی جو دو مقامات ہیں ان میں سے ایک سورۂ آلِ عمران میں ہے، جہاں حضورؐ کا اسمِ گرامی آیا ہے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ (آیت ۱۴۴) اور ایک جگہ سورۃ الاحزاب میں آپؐ کا نام نامی آیا ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (آیت ۴۰) — اس طرح چار مختلف مقامات پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی آیا ہے۔ سورہ محمدؐ اور سورۂ فتح متصلاً آئی ہیں۔ سورہ محمدؐ کی دوسری ہی آیت میں جو ہم پڑھ چکے ہیں، آپؐ کا نام نامی آیا ہے — جبکہ سورہ فتح کی آخری آیت کے آغاز میں، جو طویل آیات میں سے ہے، حضورؐ کا اسمِ مبارک آیا: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ (آیت ۲۹)

مشابہ الفاظ

دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس سورہ مبارکہ میں آنے والے تین الفاظ خاص طور لائق توجہ ہیں۔ ان تینوں کا مفہوم ایک دوسرے سے بہت ہی مشابہ ہے، بہت ہی قریب ہے — ایک ہے اِضلال، ایک ہے اِبطال

اور ایک ہے اِحباط ــــ تینوں کا حاصل کیا ہے! اعمال کا بھٹک جانا، اکارت ہوجانا، ضائع ہوجانا، بے نتیجہ ہوجانا، برباد ہوجانا، عبث ہوجانا ــــ جیسے پہلی آیت میں آیا: اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ــــ یہ لفظ تو اس سورت میں مختلف صیغوں میں بار بار آئے گا ــــ اللہ نے اُن کی کوششوں کو رائیگاں کر دیا ــــ ان کی محنت کو بے نتیجہ کر دیا ــــ اسی طرح دوسرا لفظ ہے اَلبطال ــــ یہ لفظ سورہ بقرہ میں اس طور پر آیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ــــ اے اہلِ ایمان اپنی خیرات کو باطل نہ کرلو، بے نتیجہ نہ کرلو کہ اس کا کوئی اجر و ثواب تمہیں نہ ملے ــــ اگر تم کسی کو کچھ دے کر اس پر احسان جتاؤ گے یا اور کوئی تکلیف دہ بات اِس سے کہو گے تو جو نیکی تم نے کی تھی وہ اکارت گئی ــــ یہ لفظ بھی کئی بار مختلف صیغوں میں آیا ہے ــــ تیسرا لفظ ہے اِحباط (حبطِ اعمال) سورۃ الحجرات جو سورۃ الفتح کے بعد آئے گی اُس میں بھی یہ لفظ آئے گا کہ اے مسلمانو! نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کر بیٹھنا۔ کبھی ان سے بلند آواز سے گفتگو نہ کر لینا جیسے آپس میں کر لیتے ہو ــــ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ ــــ مبادا تمہارے تمام اعمال حبط ہوجائیں، رائگاں ہوجائیں، اکارت ہوجائیں ــــ وہاں تو یہ لفظ ثلاثی مجرد سے آیا ہے۔ لیکن اس سورت میں یہ لفظ ثلاثی مزید فیہ سے باب افعال سے آیا ہے: اَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ پس اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ــــ یہ جو قریباً ہم مفہوم و ہم معنی الفاظ ہیں، ان میں باریک سا فرق کیا ہے! ــــ یہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ کسی بھی زبان کے دو لفظ بالکل ہم معنی نہیں ہوسکتے۔

اضلال کا مفہوم: جہاں تک میں نے لفظ اضلال پر غور کیا ہے تو اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کسی کی محنت، کسی کی کوشش اصل ہدف سے ہٹ جائے۔ اس نے اپنے پیشِ نظر کام کے لیے محنت بھی کی، مشقت بھی کی، خون پسینہ ایک کیا لیکن اس کی کوشش اپنے اصل ہدف سے ہٹ گئی۔ یہ ہے اضلال: اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ــــ بھٹکا دیا اللہ نے ان کی کوششوں کو ــــ مشرکینِ مکہ نے سر توڑ کوششیں کیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ روکنے کے لیے، اسلام کا راستہ روکنے کے لیے ــــ دعوتِ توحید کی توسیع میں جو رکاوٹ وہ ڈال سکتے تھے وہ انہوں نے بھرپور طور پر ڈالی ــــ لیکن ان کی تمام محنتیں رائیگاں گئیں۔ آپ

غور کیجئے کہ انہوں نے اپنے سینکڑوں سربرآوردہ لوگوں کی جانوں کی قربانی میدانِ بدر میں کس لیے دی!! اِس لیے کہ دعوتِ توحید کا راستہ روکیں اور اپنے آبائی مشرکانہ نظام کا تحفظ کریں۔ یہ مقصد ان کے پیشِ نظر تھا۔ جس کے لیے وہ کوششیں اور محنتیں کر رہے تھے، ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ حتیٰ کہ جانوں کی بازی بھی لگا دی۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اِس اعتبار سے ان کی تمام کوششوں کو رائیگاں کر دیا کہ وہ اپنے اصل ہدف ہی سے ہٹ گئیں۔ وہ جو علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ع "آہ وہ تیرِ نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف!" — لیکن یہ مختلف سی بات ہے بے اختیار زبان پر آگئی — وہاں تو مشرکین کا ہدف معیّن تھا مگر اللہ نے ان کی کوششوں کا رُخ اس کی طرف سے ہٹا دیا۔

باطل کا مفہوم: جہاں تک لفظِ باطل کا تعلق ہے جس سے بابِ افعال سے ابطال بنا تو اس کا مفہوم ہوگا ایک چیز بظاہر تو خوب نظر آ رہی ہو، لیکن نہ اس میں کوئی خیر ہو اور نہ اُس کی کوئی حقیقت ہو۔ جیسے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اے مسلمانو! تمہاری حیثیت ایسی ہو جائے گی جیسے سیلاب کے اُوپر کا جھاگ "کَغُثَاءِ السَّیْلِ" تمہاری تعداد دنیا میں بہت ہوگی لیکن اُس کا حال سیلاب کے اوپر آنے والے جھاگ کا ہوگا جیسے آج کل ہم فخر کرتے ہیں کہ اس وقت ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں — لیکن اُن کی معنوی حقیقت کیا ہے! وہ کس سے پوشیدہ ہے! — یہ ہے اصل میں باطل — قرآن مجید میں 'حق' کے مقابل میں 'باطل' کا لفظ لایا جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ حج میں فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ "یہ اس لیے کہ درحقیقت اللہ ہی 'الحق' ہے اور جن ہستیوں کو یہ پکارتے ہیں اللہ کے سوا وہ باطل ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں"۔ گویا باطل وہ شے ہے جو بظاہر نظر آئے لیکن اس کی حقیقتِ معنوی کچھ نہ ہو۔ لہٰذا ابطال کا مفہوم ہوگا کسی چیز کو محو کر دینا، مٹا دینا۔

احباط کا مفہوم: احباط کے لفظی معنی ہوں گے ضائع کر دینا، اکارت کر دینا، مراد یہ ہے کہ ایک عمل صحیح ہے درست نیت سے کیا گیا ہے، اس میں محنت بھی کی گئی ہے۔

لیکن انسان اس کے ساتھ یا بعد میں کوئی کام ایسا کر بیٹھتا ہے جو اس کے صحیح اعمال کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔ کوئی ایسی غلطی، کوئی ایسی خطا، کوئی ایسا بڑا جرم صادر ہو جاتا ہے کہ وہ کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ ہے احباط — یعنی صحیح اعمال کا برباد ہو جانا۔

اِس پوری بحث میں ہمارے لیے عبرت کا پہلو یہ ہے کہ ہمیں اپنے اعمال کے معاملے میں نہایت محتاط رہنا چاہیئے۔ یہ تو انتہائی نقصان کا سودا ہے کہ محنت بھی ہو، کوشش بھی ہو، جدّ و جہد بھی ہو اور انسان خون پسینہ بھی ایک کرے لیکن اس کا حاصل کچھ نہ ہو۔ وہ اپنے ہدف سے بھٹکی ہوئی ہوں — تو اللہ تعالےٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ آمین۔

مطالعہ کا آغاز

اس تمہیدی گفتگو کے بعد اب ہم اللہ کے نام سے مطالعہ کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اپنی توجہات کو متن (TEXT) پر اچھی طرح مرتکز فرمالیجئے — چوتھی آیت کی تلاوت میں آغاز میں کر چکا ہوں۔ اب پہلے اِس کا ایک رواں ترجمہ کر لیتے ہیں۔

"پس جب تمہاری اُن کافروں سے مُڈبھیڑ ہو (جن کا ذکر پہلی اور تیسری آیت میں آچکا ہے) تو پہلا کام یہ ہے کہ ان کی گردنیں خوب مارو۔ یہاں تک کہ جب اُن کو خوب قتل کر چکو ان کو اچھی طرح کچل چکو تو پھر زندہ بچ جانے والوں کو بحیثیتِ قیدی مضبوطی سے باندھ لو۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ احسان کرو۔ یا فدیہ کا معاملہ کرو۔ حتّٰی کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔" (یعنی حالتِ جنگ بالکلیہ ختم ہو جائے۔ کفر مغلوب اور حق غالب آجائے)

اِس آیت کی اہمیت

اِس آیت کے متعلق میں اسی درس کے دوران آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ قرآن مجید کی نہایت اہم آیات میں سے ہے۔ بعض اعتبارات سے ہم اِسے مشکلات القرآن میں شمار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس آیت پر کافی غور و خوض کرنا ہوگا اور اس کے صحیح و حقیقی مفہوم کو اچھی طرح سمجھنا ہوگا۔ اس لیے بھی کہ اس آیت پر منکرینِ حدیث نے ڈیرہ لگایا ہے۔ خاص طور پر غلام احمد پرویز صاحب

غلامی کا جو تصور اسلام میں سلف سے چلا آ رہا ہے اس کی نفی کرنے کے لیے اس آیت پر مورچہ لگایا ہے اور اپنے اس مُوقف کی تائید میں کہ اسلام میں غلامی کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، بطور استشہاد اس آیت کو پیش کیا ہے۔ حالانکہ یہ چیز احادیث سے ثابت، تعاملِ خلفائے راشدین و مہدیین رضؓ سے ثابت، صحابہ کرام رضؓ کے آثر سے ثابت، تمام فقہاؒ و مجتہدینِ اُمت سے ثابت۔ ــ پھر سب سے اہم اور فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے کہ جس میں غلامی کے متعلق صراحت سے یا کنایتہً یہ حکم آیا ہو کہ آج سے یہ ادارہ (INSTITUTION) ختم اور غلامی حرام کر دی گئی ہے۔ جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ شراب کی پہلے تو تدریجاً مذمت ہوئی اور بالآخر سورۂ مائدہ میں اس کی قطعی حرمت کا حکم آ گیا اور دھمکی آ گئی : فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ط ۔" شراب باز آتے ہو کہ نہیں !" تو جو لوگ ساری ساری عمر شراب پیتے رہے تھے، وہ تائب ہو گئے۔ لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ دیئے مے خانے برباد کر دیئے، مدینہ کی گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی طرح بہتی نظر آئی ۔ جس کے ہونٹوں تک جام پہنچ گیا تھا اُس نے حکم سُنتے ہی وہیں ہاتھ روک لیا ۔ جو گھونٹ لے چکے تھے، انہوں نے کلّی کر دی، جو کچھ حصہ حلق سے اُتار چکے تھے، انہوں نے حلق میں اُنگلیاں ڈال کر قے کر دی کہ حکم آنے کے بعد اللہ کی حرام کردہ شے ان کے شکم میں نہ رہے۔ لیکن غلامی کے ادارہ کی حُرمت کے لیے کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی لہٰذا یہ نظام چلتا رہا۔ کیا کوئی سلیم العقل شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں صراحتہً تو درکنار اگر اشارتاً بھی غلامی کی حُرمت کے متعلق کوئی آیت نازل ہوئی ہوتی اور اس کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہ جاتا !! جن لوگوں کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی جس کے وہ سالہا سال سے خوگر تھے، جو ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حرمت کا حکم آ جانے کے بعد ان لوگوں نے نگاہ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ تو اگر غلامی کی حُرمت کا صریح حکم آ جاتا تو کیا اِس بات کا امکان تھا کہ وہ قدسی صفت اصحابِ رسول غلامی کے 'INSTITUTION' کو باقی رکھتے ! ــ کیا تمام غلام دفعتہً آزاد نہ ہو جاتے !! یہ دوسری بات ہے کہ آج کے دَور میں غلامی کی گنجائش (SCOPE)

غلامی کا جو تصور اسلام میں سلف سے چلا آ رہا ہے اس کی نفی کرنے کے لیے اس آیت پر مورچہ لگایا ہے اور اپنے اس مُوقف کی تائید میں کہ اسلام میں غلامی کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ بطور استشہاد اس آیت کو پیش کیا ہے۔ حالانکہ یہ چیز احادیث سے ثابت، تعاملِ خلفاءِ راشدین و مہدیین رض سے ثابت، صحابہ کرام رض کے اثر سے ثابت، تمام فقہاء و مجتہدینِ امت سے ثابت، ۔۔ پھر سب سے اہم اور فیصلہ کن بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے کہ جس میں غلامی کے متعلق صراحت سے یا کنایتہً یہ حکم آیا ہو کہ آج سے یہ ادارہ (INSTITUTION) ختم اور غلامی حرام کر دی گئی ہے۔ جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ شراب کی پہلے تو تدریجاً مذمت ہوئی اور بالآخر سورۂ مائدہ میں اس کی قطعی حرمت کا حکم آ گیا اور دھمکی آ گئی : فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔" تم اب باز آتے ہو کہ نہیں!" تو جو لوگ ساری ساری عمر شراب پیتے رہے تھے، وہ تائب ہو گئے۔ لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ دیئے مے خانے برباد کر دیئے، مدینہ کی گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی طرح بہتی نظر آئی۔ جس کے ہونٹوں تک جام پہنچ گیا تھا اُس نے حکم سنتے ہی وہیں ہاتھ روک لیا۔ جو گھونٹ لے چکے تھے، انہوں نے کلی کر دی، جو کچھ حصہ حلق سے اُتار چکے تھے، انہوں نے حلق میں انگلیاں ڈال کر قے کر دی کہ حکم آنے کے بعد اللہ کی حرام کردہ شے ان کے شکم میں نہ رہے۔ لیکن غلامی کے ادارہ کی حُرمت کے لیے کوئی ایسی آیت نازل نہیں ہوئی لہٰذا یہ نظام چلتا رہا۔ کیا کوئی سلیم العقل شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں صراحتہً تو درکنار اگر اشارتاً بھی غلامی کی حُرمت کے متعلق کوئی آیت نازل ہوئی ہوتی اور اس کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہ جاتا!! جن لوگوں کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی جس کے وہ سالہا سال سے خوگر تھے، جو ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ حرمت کا حکم آ جانے کے بعد ان لوگوں نے نگاہ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ تو اگر غلامی کی حُرمت کا صریح حکم آ جاتا تو کیا اس بات کا امکان تھا کہ وہ قدسی صفت اصحابِ رسول غلامی کے 'INSTITUTION' کو باقی رکھتے! ۔۔ کیا تمام غلام دفعتہً آزاد نہ ہو جاتے!! یہ دوسری بات ہے کہ آج کے دور میں غلامی کی گنجائش (SCOPE)

کیا ہے! آج اس کے اطلاق (APPLICATION) کی صورت کیا ہوگی! یہ معاملات بالکل علاحدہ ہیں، میں اس وقت اس مسئلے پر بحث نہیں کر رہا۔ اس وقت میں جو بات آپ کے سامنے رکھنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ غلامی، کا ذکر آپ کو احادیث میں ملے گا، تعاملِ صحابہ رضؓ میں ملے گا۔ فقہ کی کتابوں میں اس کا مستقل باب ملے گا۔ لہٰذا میں پھر عرض کروں گا کہ جو چیز حرام کر دی گئی ہو، کیا صحابہ رضؓ کرام اس پر عمل پیرا رہ سکتے تھے! اور کیا ہمارے فقہاءؒ اور مجتہدینؒ امت اس بات سے لاعلم اور ناواقف رہتے کہ غلامی کا INSTITUTION حرام ہو چکا ہے!!

اس تجدد پسندی کے غلط نتائج : میں نے اغلباً ایک سال قبل ایک تقریر میں عرض کیا تھا کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر بات چھوٹی سی ہوتی ہے لیکن اس تل کی اوٹ میں پہاڑ ہوتا ہے۔ ایک ایسی بات کے متعلق جو صحابہ کرام رضؓ، تابعین عظام رحؒ، محدثین کرام رحؒ اور ائمہ مجتہدین رحؒ کے تعامل اور آراء کی روشنی میں متواتر چلی آرہی ہو، اگر ہم مان لیں کہ یہ تو غلط ہے، قرآن مجید کے نص اور اس کی منشاء و مدعا کے خلاف ہے۔ تو گویا ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ یہ مسئلہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تابعین سے لے کر اب تک کے تمام علمائے حق میں سے کوئی بھی پوری عمر قرآن مجید کا مطالعہ اور اس پر غور و تدبر کرنے اور اس کی تعلیم و تدریس میں مصروف رہنے کے باوجود اس "حقیقت" کو نہ سمجھ سکا کہ راہِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد و قتال کے نتیجہ میں جو کفار رقیہ ہو جائیں انہیں از روئے قرآن غلام نہیں بنایا جا سکتا! قرآن نے تو ہمیشہ کے لیے غلامی کے سلسلہ اور ادارہ (INSTITUTION) کو حرام اور ناجائز قرار دے دیا ہے! اس مسئلہ کو صحیح طور پر قرآن مجید سے سمجھا ہے تو وہ غلام احمد پرویز صاحب نے سمجھا ہے — یہ بات اگر کسی کے ذہن و قلب اور شعور و ادراک میں بیٹھ جائے گی تو وہ تمام اسلاف اور مفسرینِ متقدمین بلکہ صحابہ کرام رضؓ تک سے بدگمان ہو جائے گا — یہ ہے سب سے خطرناک بات۔ اب گویا وہ اپنے ماضی سے کٹ گیا، اسلاف سے کٹ گیا اس کے حال میں اُن کی کوئی عظمت نہیں رہی — اب وہ کٹی ہوئی پتنگ کے مانند ہو گیا ہے کہ ہوا

کے رحم وکرم پر ہے ہوا اُسے جدھر چاہے لے جائے — یہی معاملہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا تھا۔ رفع و نزولِ مسیحؑ کے مسئلہ پر اُس نے بحث اُٹھائی سلف سے لے کر اُس وقت تک جو عقیدہ تواتر سے چلا آرہا تھا، اُسے اُس نے غلط قرار دیا اور اس کے لیے عقلی دلائل کے انبار لگا دیئے۔ اب جس نے اس کی یہ بات مان لی، اُس کا اپنے ماضی سے تعلق منقطع ہوگیا اور وہ اپنے اسلاف کے فہم و ذکا کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہوگیا۔ ایسے لوگ بہت آسان شکار ثابت ہوں گے کہ ان کے "ممدوحین" اُن سے رفتہ رفتہ جو چاہیں منوالیں[1]۔ تو بات بظاہر بہت چھوٹی ہوتی ہے لیکن اس کا نتیجہ بہت دُور رس ہوتا ہے — ایک گمراہی پر پھر بہت سی گمراہیوں کی تہ پر تہہ جمتی چلی جاتی ہے اور ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ سامنے آجاتا ہے — لٰہذا اس پس منظر میں اس آیت کی بڑی اہمیت ہے۔ اِس لیے دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ اس کے ایک ایک لفظ پر اپنی توجہات مرتکز کیجئے اور اُسے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

آیت کا مطالعہ

فرمایا: فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا "پس جب تمہاری ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو جائے" لِقَا، ملاقات کو کہتے ہیں۔ لیکن جب جنگ کے یہ دو فریق آمنے سامنے مقابلہ کے لیے آجائیں تو اُسے یہاں 'لِقَا' سے تعبیر کیا گیا اور ہمارے محاورہ میں اس کے لیے 'مڈبھیڑ ہوجانا' کے الفاظ بہت مناسب ہیں — تو یہاں فرمایا کہ اے اہلِ ایمان! جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو جائے تو پہلا کام یہ کرو: فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط "پس ان کی گردنوں کو مارو جیسا کہ مارنے کا حق ہے" — اب نوٹ کیجئے کہ یہاں 'ضَرْبَ' مصدر کی شکل میں آیا ہے اور مفعول مطلق کا فائدہ دے رہا ہے — اور اس بات کو عربی

---

[1] چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے تو بات اپنے دعویٰ نبوت تک پہنچادی اور پرویز صاحب نے اسی بات کے سہارے نہ معلوم کتنوں کو انکارِ حدیث کے فتنہ میں مبتلا کر دیا۔ ان لوگوں کے نزدیک سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دائمی حجیّت کا مقام نہیں رکھتی۔

زبان کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ مصدر کو مفعولِ مطلق کے طور پر استعمال کرنے سے کلام میں تاکید اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۂ نساء میں فرمایا: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ "اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسے کلام کیا جاتا ہے" تو یہاں فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط قرآن مجید کی بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔ چنانچہ ہمارے مفسرین نے یہاں فعلِ امر کو محذوف مانا ہے۔ یہاں اس کا مفہوم ہو گا: فَاضْرِبُوْا هُمْ ضَرْبَ الرِّقَابِ ط "مارو ان کو اور ان کی گردنوں کا مارنا مارو — یعنی ان کو کیفر کردار تک خوب اچھی طرح پہنچاؤ —

اِثخان کا مفہوم: آگے فرمایا: حَتّٰى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ ط "یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب کچل دو" یہ اثخان کا لفظ سورۃ الانفال میں بھی آیا ہے اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ سورت غزوۂ بدر کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی۔ اور سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو ہم پڑھ رہے ہیں وہ غزوۂ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی — اور یہ اثخان کا لفظ صرف ان دو سورتوں میں آیا ہے۔ اثخان کا مفہوم ہے دشمن کو چور چور کر دینا، کچل دینا، ایسی خونریزی کرنا کہ اس میں کوئی ہمت و حوصلہ باقی نہ رہے۔ کوئی مقاومت نہ رہے۔ کمر ہمت اس درجہ ٹوٹ جائے کہ اس میں دوبارہ مقابلہ میں آنے کا ارادہ تک باقی نہ رہے۔ یہ ہے اثخان کا مفہوم — سورۃ الانفال میں جو یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

آگے چلیے فرمایا: فَشُدُّوا الْوَثَاقَ — ترجمہ ہو گا کہ "پھر ان کو باندھو اور خوب مضبوطی کے ساتھ باندھو" شَدَّ، يَشُدُّ، کے معنی ہیں زور کے ساتھ۔ پھر اس میں باندھنے کا مفہوم بھی ہے۔ آگے آیا وَثَاقَ اور یہ لفظ ہمارے یہاں بھی وثیقہ اور میثاق کی شکل میں مستعمل ہے — میثاق کے معنی ہیں معاہدہ۔ معاہدہ وہ چیز ہوتی ہے جو باندھ دیتی ہے — لہٰذا وہ فریقوں کو باہم باندھ لینے والی جو چیز ہے وہ میثاق ہے — تو یہاں "فَشُدُّوا الْوَثَاقَ" کا مطلب ہوا "پھر ان کو باندھو

اور خوب مضبوطی سے باندھو" ۔ یہ مَیں نے قریباً لفظی ترجمہ کیا ہے ۔ اس سے مراد کیا ہے! اُسے مَیں بعد میں بیان کروں گا ۔ آگے فرمایا: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً "تو بعد میں پھر خواہ ان پر احسان کرو خواہ ان سے فدیہ قبول کرلو" یہاں بَعْدُ کا تعلق کس سے ہے! وہ بات آگے آرہی ہے: حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا "یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ اپنے ہتھیار رکھ دے" یعنی یہ کہ کشمکش ختم ہوجائے، قطعی فیصلہ ہوجائے اور تمہاری کامیابی فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ چکی ہو ۔ گویا ایسی صورتِ حال کہ جنگ بالکل ختم ہوگئی، دشمن نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے ۔ اصل میں بَعْدُ کا تعلق آیت کے اس ٹکڑے سے ہے ۔ گویا ترتیب یوں بنے گی: فَشُدُّوا الْوَثَاقَ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً "پس ان کو باندھے رکھو خوب مضبوطی کے ساتھ۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ تو پھر اس کے بعد اب تمہیں اختیار ہے کہ چاہو تو ان پر احسان دھرو اور انہیں چھوڑ دو اور چاہو تو فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو"

قرآن مجید کا خاص اسلوب: اس کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ ۔ یہ قرآن مجید کا مخصوص اسلوب ہے کہ بات تو پوری ہوگئی لیکن "ذٰلِكَ" فرما کر ساری بات کا اعادہ فرمایا جارہا ہے کہ "دیکھو! یہ ہے وہ بات جو کہی جارہی ہے"۔ یعنی اس کو اچھی طرح سمجھ لو، اِسے حرزِ جان بنالو، اِسے ذہن نشین کرلو ۔ یہ ہے تمہارے کرنے کا کام ۔ اس سے ذرہ برابر بھی انحراف نہ ہونے پائے ۔ یہ ہے حالاتِ موجودہ کے لیے ہدایت جو اللہ تعالیٰ تمہیں دے رہا ہے ۔

زیرِ مطالعہ آیت کے اس حصہ کو سمجھنے کے لیے ہجرت کے بعد کی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ اس کشاکش (STRUGGLE) کے تین مراحل کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو آغازِ دعوت سے لے کر اس سورۂ مبارکہ کے نزول تک مشرکینِ مکہ اور اہلِ ایمان میں ہوتی چلی آرہی تھی۔

کشمکش کے تین مراحل

مکہ میں اہلِ ایمان کو ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کو حکم تھا کہ مشرکین کے مظالم جھیلو برداشت کرو، خواہ وہ تمہاری جان لینے کے درپے ہو جائیں۔ کسی صاحبِ ایمان کو اپنی مدافعت میں کسی جوابی کارروائی کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اِس مرحلے کی طرف واضح اشارہ سورۃ النساء میں موجود ہے کہ: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ" اسے ہم کشمکش کا پہلا مرحلہ قرار دے سکتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ: ایٹ کا جواب پتھر سے دینے کی عام اجازت۔ ہجرتِ مدینہ کے ساتھ ہی اس مرحلے کا آغاز ہو جاتا ہے کہ: "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" (الی الخ) ۔ سورۃ الحج کی اِس آیت کے متعلق میرا خیال تھا۔ اور الحمد للہ مجھے اس کی تائید میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول بھی مل گیا جس سے مجھے تقویت حاصل ہو گئی۔ کہ یہ آیت اثنائے سفرِ ہجرت میں نازل ہوئی ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں ورودِ مسعود سے پہلے پہلے اہلِ ایمان کو اجازت مل گئی کہ اب تم بھی بدلہ لے سکتے ہو۔ یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

تیسرا مرحلہ: ہجرتِ مدینہ کے بعد ابتدائی دو سالوں کے دوران سورہ بقرہ نازل ہوئی۔ جس میں قتال کا حکم وارد ہوا: "وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ" "جنگ کرو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں"۔ پھر اسی سورہ بقرہ میں آگے چل کر فرمایا گیا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ۔ "تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے"۔ اِس حکم کے ذریعے جنگ تو فرض کر دی گئی۔ لیکن اُس وقت تک جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ البتہ آہستہ آہستہ حالات اُدھر جا رہے تھے کہ یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ باقاعدہ مسلح تصادم کا مرحلہ جلد آ کر رہے گا۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد حضورؐ کے اہم اقدامات

کچھ دنوں سے میں جمعوں کی تقریروں

میں "اسلامی انقلاب" کے مراحل سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے تسلسل کے ساتھ بیان کر رہا ہوں[1]۔ میں ان میں بتا چکا ہوں کہ مدینہ تشریف لانے کے بعد ابتدائی چھ مہینوں تک آپؐ نے مشرکین مکہ کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ بلکہ فی الفور اپنی توجہات اور مساعی کو مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مستحکم اور مضبوط (CONSOLIDATE) کرنے کی طرف مرتکز رکھا۔ اس عرصہ میں حضورؐ نے تین ایسے کام انجام دیئے جن کا تعلق بالکلیہ داخلی استحکام سے تھا۔

پہلا کام مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کا آغاز تاکہ جلد از جلد نماز پنجگانہ کی ادائیگی، تعلیم و تربیت اور مشاورت کے لیے ایک مرکز مہیا ہو جائے۔

دوسرا کام: مہاجرین و انصار میں مواخات، بھائی چارے کی عملی صورت — تاکہ ان میں کوئی مغائرت نہ رہے — اور یہ کام اس شان سے عمل میں آیا کہ تاریخِ انسانی اس کی کوئی نظیر آج تک پیش کرنے سے قاصر ہے۔

تیسرا کام: یہودیوں کے اُن تین قبائل کے ساتھ معاہدے، جو مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے کہ وہ مشرکین مکہ کا ساتھ نہیں دیں گے بلکہ اگر وہ مدینہ پر حملہ آور ہوں گے تو یہود دفاع اور مدافعت میں اہلِ ایمان کا ساتھ دیں گے — یہ تینوں کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست اور تدبر کے وہ شاہکار ہیں کہ کٹر سے کٹر دشمنانِ اسلام بھی ان پر حضورؐ کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں — یہ معاہدے یہود کے گلے کا ہار بن گئے اور ان کی وجہ سے وہ کبھی کھل کر مشرکین کی حمایت میں مسلمانوں کے خلاف کھڑے نہیں ہو سکے لیکن اندر ہی اندر مشرکین کے ساتھ ساز باز اور ریشہ دوانیاں کرتے رہے اور ان کو مسلمانوں کے خلاف مسلح اقدامات کرنے پر اکساتے رہے۔ اس طرح وہ معاہدے کی خلاف ورزی کا ارتکاب

---

[1] ڈاکٹر صاحب محترم کے یہ خطابات ماہنامہ میثاق کے جون ۱۹۸۵ء کے شمارے سے سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں۔ اور ان کے کیسٹس بھی موجود ہیں (ادارہ)

کرتے رہے جس کی بنا پر اس میں مختلف مواقع پر حضورؐ کو ان تینوں قبائل کے خلاف اقدامات کرنے پڑے اور مدینہ ان آستینوں کے سانپوں کے وجود سے خالی ہوگیا۔

مشرکینِ مکہ کے خلاف اقدام کی ابتدا: مدینہ میں ابتدائی چھ ماہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے داخلی استحکام میں لگانے کے بعد مشرکینِ مکہ کے خلاف اقدام کرنے کی طرف توجہ فرمائی۔ آپؐ نے مکہ والوں کے خلاف مہمیں اور دستے بھیجنے شروع فرمائے۔ ان میں سے چار میں آپؐ خود بھی بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔ ان مہموں کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ قریش کے تجارتی راستوں کو مخدوش بنا دیا جائے اور قریش پر واضح کر دیا جائے کہ تمہاری معاش کی شہ رگ ہماری دسترس میں ہے، ہماری زد میں ہے۔ یہ گویا ان کے لیے ایک دھمکی کا انداز تھا۔ دوسرے یہ کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان بسنے والے جن قبائل سے قریش کے ساتھ دوستی کے معاہدے تھے، حضورؐ نے ان سے معاہدے کرکے یا تو ان کو اپنا حلیف بنا لیا یا ان کو غیر جانبدار (NEUTRALIZE) کر لیا۔ حضورؐ کے ان دو اقدامات میں سے پہلے کو جدید اصطلاح میں قریش کی معاشی ناکہ بندی (ECONOMIC BLOCKADE) اور دوسرے کو سیاسی ناکہ بندی (POLITICAL ISOLATION) قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ رمضان المبارک سنہ ۱ھ سے لے رمضان سنہ ۲ھ تک یعنی غزوۂ بدر سے پہلے پہلے ایک سال کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ مہمیں بھیجیں۔ لیکن پہلی باقاعدہ جنگ درحقیقت غزوۂ بدر ہی ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے نزول کے متصلاً بعد پیش آئی۔

اس سلسلۂ درس کے معاملے میں میرا طرزِ عمل: اپنے متعلق آپ کو ایک بات اس موقع پر بتاتا ہوں۔ ایک طویل عرصے کے بعد سلسلہ وار درسِ قرآن کا معاملہ اب دوبارہ شروع ہوا ہے تو اس سلسلہ کی پہلی سورۃ یہ سورۃ محمدؐ ہے — اور ظاہر ہے کہ یہ وہ سورتیں ہیں جن کا درس اس سے پہلے میں نے نہیں دیا۔ اس لیے کہ ہم قرآن کے ترتیب وار مطالعہ کے نتیجے میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تجدیدِ درس کے فیصلہ کے بعد سے یہ سورۂ مبارکہ میرے ذہن پر طاری ہے اور

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس سورہ مبارکہ پر غور و فکر مسلسل جاری ہے ۔ چنانچہ جب سے یہ درس شروع ہوا ہے، میں قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں فجر کی نماز میں متعدد بار اس کی تلاوت کرا کے اسے سُن چکا ہوں ۔۔۔ ایک ہے انسان کا خود پڑھنا اور غور و فکر کرنا، ایک ہے کسی سے اس کی قراءت توجہ کے ساتھ سُننا ۔۔۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ تاثیر اور افادیت ہے ۔۔۔ تو قرآن مجید کو پڑھنے اور سمجھنے کا محض کوئی ایک انداز نہیں ہے ۔۔۔ میں نے اس سورۂ مبارکہ پر ہر پہلو سے اپنی امکانی حد تک غور و فکر کیا ہے۔

سورۂ مبارکہ کا زمانۂ نزول : اس غور و فکر کے نتیجہ میں میرا گمان یہ ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ اُس مشاورت کے بعد نازل ہوئی ہے جس میں فیصلہ ہُوا تھا کہ اب ہمیں قریش کے لشکر کی طرف چلنا ہے جس کے نتیجہ میں غزوۂ بدر واقع ہُوا۔ واللہ اعلم ۔ اس واقعہ کو ذہن میں تازہ کر لیجئے ۔ غزوہ بدر سے پہلے کوئی باقاعدہ جنگ نہیں ہوئی تھی ۔ حضور ؐ نے صرف اقدامات فرمائے تھے اور آٹھ مہمیں بھیجی تھیں ۔ ان مہموں میں سے کسی میں بھی آپ ؐ نے انصار ؓ میں سے کسی کو شامل نہیں فرمایا تھا ۔ صرف مہاجرین ؓ ان مہمات میں شامل کیے گئے تھے ۔ مہاجرین مکہ سے بے سر و سامانی کی حالت میں آئے تھے ۔ بے گھر تھے اور اہل و عیال سے کٹے ہوئے تھے ۔ گویا وہ تو جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے ۔ لہٰذا ان کو تو جہاد و قتال کے لیے کسی اضافی تشویق اور ترغیب کی ضرورت نہیں تھی ۔ البتہ انصار ؓ کا معاملہ یہ تھا کہ انہوں نے جب مکہ جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور آپ ؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی تھی تو اس وقت بیعت عقبہ ثانیہ میں یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ اگر مدینہ پر حملہ ہو گا تو ہم آپ ؐ کی ایسے حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں ۔ ابھی تک مدینہ پر کوئی حملہ ہُوا نہیں تھا ۔۔۔ یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھیئے کہ غزوہ بدر سے پہلے کی یہ آٹھ مہمات دفاعی نوعیت کی نہیں تھیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا آگے بڑھ کر اقدامات فرمائے تھے ۔۔۔ باطل اگر گھر میں بیٹھا رہے گا تو کیا آپ ؐ اسے چھوٹ دیئے رکھیں گے کہ وہ باقی رہے! بلکہ اہلِ ایمان کا

تو کام ہی باطل کو ختم کرنا ہے۔ دراصل یہ ہمیں تو دشمن کو اس کے بل سے نکالنے کے لیے تھیں۔ ان آٹھ مہموں میں آخری مہم، غزوہ ذوالعشیرہ کہلاتا ہے۔ اس مہم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ اس میں آپؐ کے ہمراہ ڈیڑھ سو افراد تھے جو تمام کے تمام مہاجرین تھے۔ اس مہم کا مقصد اس بڑے تجارتی قافلہ کو روکنا (یعنی DISTURB کرنا) تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام جا رہا تھا۔ اس قافلہ میں بہت سامان تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس سے مدینہ پر چڑھائی کے لیے سامان حرب فراہم کیا جائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ حضورؐ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی قافلہ کافی آگے نکل چکا تھا۔ لہٰذا حضورؐ واپس تشریف لے آئے۔ چنانچہ اسی اہم تجارتی قافلے کے بارے میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ وہ واپس آ رہا ہے تو حضورؐ نے اس قافلہ کا راستہ روکنے کا ارادہ فرمایا۔ معلوم ہو چکا تھا کہ قافلہ کے ساتھ صرف تیس یا چالیس محافظ ہیں۔ اس لیے آپؐ نے کوئی خاص تیاری نہیں فرمائی۔ اس موقع پر ساٹھ کے قریب مہاجرینؓ ساتھ تھے۔ پھر یہ بھی پہلی بار ہوا کہ قریباً ڈھائی سو انصارؓ بھی ساتھ تھے۔ جو اپنی مرضی سے اس مہم میں شامل ہوئے تھے۔ ابھی حضورؐ مدینہ سے کچھ دور پہنچے تھے کہ آپؐ کو اطلاع ملی کہ مکہ والوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنے والے ہیں لہٰذا وہاں سے ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کے مدینہ روانہ ہو چکا ہے۔

مشاورت: اب چونکہ ایک بڑا حملہ پیش آ رہا تھا لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہم میں شریک مہاجرینؓ و انصارؓ کو جمع فرمایا اور مشورے کے لیے یہ بات رکھی کہ مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے ابوسفیان کی سرکردگی میں آ رہا ہے اور مالِ تجارت سے لدا پھندا ہے۔ تیس یا چالیس محافظ اس کے ساتھ ہیں لیکن دوسری طرف جنوب سے ایک ہزار کا مسلح لشکر بھی مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب مشورہ دو کہ ہمیں کدھر جانا چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ ان دو میں سے ایک پر ہمیں ضرور فتح عطا فرمائے گا۔ اس موقع پر مہاجرینؓ نے

تقریریں شروع کیں کہ حضورؐ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں! جو آپؐ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت مقداد ابنِ اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تقریریں کیں۔ آخر الذکر نے تو یہ کہا "حضورؐ ہمیں حضرت موسےٰؑ کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجیے جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ط " موسےٰؑ تم اور تمہارا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔" آپؐ بسم اللہ کیجیے کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائے لیکن حضورؐ پھر بھی انتظار کی کیفیت میں تھے۔ آپؐ کی نگاہیں بار بار انصارؓ کی طرف اُٹھ رہی تھیں ــــ اس لیے کہ تین سو تیرہ میں ساٹھ یا تیراسی مہاجرینؓ تھے اور باقی تعداد انصارؓ کی تھی۔ پھر شاید بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے الفاظ بھی حضورؐ کے پیشِ نظر ہوں ـ جس کی رُو سے انصارؓ صرف مدینہ پر حملہ کی صورت میں مہاجرینؓ کے دوش بدوش لڑنے کے پابند تھے ــ اب انصارؓ کے سردار حضرت سعدؓ کو خیال آیا کہ حضورؐ کا رُوئے سخن ہماری طرف ہے ــــ روایات میں اختلاف ہے کہ یہ کون سے سعد تھے! سعدؓ ابنِ معاذ رئیس قبیلہ اوس یا سعدؓ ابنِ عبادہ رئیس قبیلہ خزرج ـــــ! میرا رجحان یہ ہے کہ یہ رئیس خزرج تھے ـ چونکہ ان کا قبیلہ تعداد میں اوس سے تین گنا زیادہ تھا ــ گویا اُن کو پورے انصارؓ کی قیادت حاصل تھی ــ لہٰذا انہوں نے کھڑے ہو کر تقریر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> "حضورؐ شاید آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے! بھول جایئے کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ کے وقت کیا طے ہوا تھا! اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ ــ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں۔ ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ جب ہم نے آپؐ کو اللہ کا رسول مان لیا ہے تو اب ہمارے پاس اختیار کون سا رہ گیا! حضورؐ آپؐ جو حکم دیں گے اُسے ہم بسر و چشم بجالائیں گے (سِرْ بِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ) اے اللہ کے رسولؐ لے چلیے ہمیں جہاں بھی لے جانا ہو۔ خدا کی قسم، اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے

(باقی صلا پر)

دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر (۲)

اسلام برصغیر پاک و ہند میں

ڈاکٹر اسرار احمد

- ورودِ اوّل : سندھ میں
- ورودِ ثانی : شمال مغرب سے
- ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج لیکن اسلام کے زوال کی انتہا : اکبر اعظم علیہ ما علیہ
- الفِ ثانی کا تجدیدی کارنامہ :
  - شیخ احمد سرہندیؒ
  - شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ
  - امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ

برّصغیر پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اولاً عینِ عرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر اَسّی برس[1] بیت چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گذر چکا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر 'بابُ الاسلام' سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منور کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جذر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برّصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت[2] کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتّع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار[3] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشّح عرب تاجروں

---

[1] آنحضورؐ کا سنِ وفات ۶۳۲ء ہے اور سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔

[2] بقول علامہ اقبال ؎ شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

[3] رستم سپہ سالارِ افواجِ ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار ہیں"۔

کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے ـــــ لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی درّوں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید یک بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیت واقعتہً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گذر گیا۔ اور اگرچہ اس بار موجودہ پاکستان کے نصف شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو ادھر آتا ہے اُدھر گذر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکّن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جذر کے مختلف مدارج و مراحل سے گذرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے غدر پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اوّل کے دوران، یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل غلام[1] بادشاہ تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان خلجی، لودھی وغیرہ۔ حکمران رہے اور نصف ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دور رہے جس کے کل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دو سو برس[2] اُن کی اصل عظمت و سطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمین بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!")

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشاۃِ اُولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو

---

[1] تاریخ اسلام کا یہ دَور عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سربرآرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!

[2] یعنی ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات تک!

چکا تھا اور خلافتِ بنی عبّاس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا[1] اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار بھی گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ——— اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دُوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال[2] و جمال کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ——— اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں مُلوک، احبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث[3] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں[4]:

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سَوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

——— اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی

---

[1] چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتلِ عام ہوا کہ الامان والحفیظ ——— اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِعام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جاتا ہے۔ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدیؒ نے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ——— بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیرالمؤمنیں!
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک ——— سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

[2] ؎ شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود ——— فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

[3] گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ ؎

بِک گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ ——— خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابقِ واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی بخصوص تاریخِ اسلام کے اس دور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالمِ اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی!

[4] حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں: ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری ——— اے کُشتۂ مُلّائی و سُلطانی و پیری

(EXEPTIONAL) شخصیتیں پیدا کیں جیسے صلاح الدّین ایوبیؒ اور ناصر الدّین محمودؒ ایسے درویش بادشاہ اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامعِ سیف و قلم شخصیت، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور تک ایک جانب مسلمان حکمران و سلاطین اکثر و بیشتر "آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ[1]" کے مصداقِ کامل بن چکے تھے اور دوسری جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریت بھی آیاتِ قرآنی: "لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ" (المائدہ: ۶۳) اور "اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" (توبہ: ۳۴) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسْرَتَاهُ وَیَا اَسَفَا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف و سناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس و قلم جدا، اور زیبِ منبر و محراب اور تھے اور زینتِ میدانِ جنگ و قتال اور، چنانچہ ابتدا میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمّد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسمٰعیل بخاری اور شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تربیت کی انتھک کوششیں، اور بعد میں ایک طرف قطب الدّین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگانِ سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے، قلوب کے تصفیے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط و تعلّق موجود تھا جس کا عظیم ترین نشان (SYMBOLS) ہے سلطان التمش کی جامع الصّفات شخصیت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کا حلقہ بگوش اور صد درجہ عابد و زاہد انسان بھی ——— یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوئے

---

[1] علامہ اقبال مرحوم نے الفاظ قرآنی "اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً" (سورۃ النمل: ۳۴) کے حوالے سے کس قدر زندہ اشعار کہے ہیں:

آبتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الملوک ——— سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر ——— پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز ——— دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے ——— حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

اور وہاں خواجہ مرحوم کی اس وصیت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنتیں چھوٹی ہوں نتیجۃً مجمعے پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تأمّل و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التمش تھا۔!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب و روز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گذرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید برآں، ہندوستان میں اسلام علاقۂ ماوراء النّہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجونِ مرکّب علمِ کلام کا دَور دَورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدت الوجود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیّت اور دوسرے وجودی تصوّف۔

قرآنِ حکیم یہاں ابتدا ہی سے صرف ایک کتابِ مقدّس کی حیثیّت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد محض رہی اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدُود رہی اور عام بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکار و دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بُعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غُلُوّ فی الحنفیّت اور بُعد عن حدیث الرّسُولؐ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سُلطان غیاث الدّین تغلق کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظام الدّین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدّین کے مابین مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدّین نے ایک حدیث رسولؐ

کو تو بلا کسی جھجک اور تأمل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ :

"تو مقلد ابوحنیفہ ہستی، ترا با حدیث رسولؐ	تم مقلد ابوحنیفہ ہو یعنی حنفی ہو تمہیں حدیث
چہ کار؟ قول ابی حنیفہ بیار!"	رسولؐ سے کیا سروکار؟ اگر امام ابو حنیفہ کا کوئی قول
	پیش کر سکتے ہو تو کرو!

جس پر حضرت خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اُٹھ گئے کہ :

"سبحان اللہ! کہ با وجود قول مصطفویؐ، از من	سبحان اللہ! نبی اکرمؐ کے فرمان کے ہوتے ہوئے
قول ابی حنیفہؒ می خواہند!" (سیر العارفین)	مجھ سے امام ابو حنیفہؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر! اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور اُمراء و عمایدِ سلطنت کی تھی اور اُن کے ساتھ بطور تتمّہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء، مدرسین و معلمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دُنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشددانہ ظاہر پرستی اور قانونی مُوشگافی کا دَور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف تصوّف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوتے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطّاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا۔ ان تمام سلاسل میں وحدت الوجود کو گویا اصُولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے زیرِ اثر کیف و سرور، جذب و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنا فی اللہ کو شغل و سلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قوائے مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دُور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں ——— باطنی احوال و کوائف پر توجہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیّت

ہوتی جا رہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا عشق و
ت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتباعِ سنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے
م یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر
نے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام
م" پر عمل عام ہو گیا تھا نتیجۃً ملتِ اسلامی کا جُداگانہ تشخّص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت
ب فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بُغض اور عداوت
ں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش
علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک بُعدِ رابع (FORTH DIMENSION)
ضافہ ہو گیا۔ اوائل عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیت کی درآمد سے جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا
ں کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات و رسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آ گیا!

مسلم انڈیا کا سُنہرا دَور بلاشبہ اس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دَورِ خاندانِ غلاماں، جس میں
ت، احبار و رہبان کی تثلیث اگرچہ اصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزّل و انحطاط کے آثار
یاں ہوئے تھے نہ باہمی بُغض و عناد کے بلکہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و
دن موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آ جاتی ہیں لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا
ال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا
گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اُترتی چلی گئیں ــــــ تا آنکہ مغلِ اعظم شہنشاہ
ر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی
ظ ہو کہ عین اُس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النہار پر
ت رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہو گئی! یہاں تک
م نہاد "دینِ الٰہی" نے دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اُسے
ینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل
ن کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مد کے آثار جنم لیتے ہیں

ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دور سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا
بن گیا! بقول علامہ اقبال ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغل اعظم علیہ ما علیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع و مشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا ہی کیا تھا[1] اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت سرزمین ہند میں دو خورشید ہدایت بھی طلوع ہوئے: ایک مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (جن کا سن ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مصلحانہ و مجددانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اول و آخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو گئی۔

ان میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدد کی مساعی میں پُر جوش مجددانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخ محدث کی کوششوں پر خاموش مصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرت مجدد کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمین ہند میں علم حدیث نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرت محدث نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دور رس ثابت ہوئے۔

حضرت مجددؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیح عقائد، ردّ بدعات، التزام شریعت اور اتباع سنت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی و نظری اور اخلاقی و عملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی۔ چنانچہ تردید شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے

---

[1] اکبر کی حکومت کو استحکام ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہو گیا

تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت' اور 'شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفۂ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدّباب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ نتیجۃً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی۔ عشق و محبّت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا۔ فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ حاصل ہوا اور جذب و سکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوئے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّت اسلامیہ کا جُداگانہ تشخص از سرِ نو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیت حاصل ہے دینِ محمدی ص بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علّامہ اقبال مرحوم:

حاضر ہوا میں شیخ مجدّدؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

سلسلۂ نقشبندیہ جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرتِ مجدّدؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسل طریقت میں سے اقرب الی الشریعت ہے، اور حضرت مجدّدؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشّان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرت مجدّدؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصّہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ باقویہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن "ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی" کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرت مجدّدؒ کے احفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردّ بدعت و رفض کے جُرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سرِ نو

تازہ کیا گویا ع "من از سرِ نو جلوہ دہم دار ورسن را!" (سرمد)

بایں ہمہ، حضرت مجددؒ کے یہاں بھی حنفیّت میں غلو اُسی شدّت کے ساتھ موجود ہے جو مُسلم انڈیا کی پُوری تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ گویا حضرت مجددؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دَورِ غلاماں میں) اس کا آغاز ہُوا تھا لیکن ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو!" کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

البتّہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدّثؒ کی شخصیّت بعض پہلوؤں سے تو حضرت مجددؒ ہی کی شخصیّت کا ظلّ معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیّت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتابِ رُشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہ ہی کے مرید بھی لیکن اس کے باوجود کہ انہیں بھی وحدتُ الوجود سے بُعد تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہ آتے۔ اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدد نہیں بلکہ فقۂ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اوّلاً انہی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجددؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کے بَین بَین نظر آتے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ ازسرِ نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدّثؒ نے دین کا تعلق 'اس اصلِ ثابت' کی 'فرعِ اوّل' کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، اُن کی شخصیّت حضرت امام الہندؒ کی شخصیّت کا مقدّمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرت محدّث کی اصل خدمت (CONTRIBUTION) ہے۔ کہ انہوں نے علمِ حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا۔ اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ خود انہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُن کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انہوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصّل شرح (لمعات التنقیح) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اشعۃ اللّمعات) فارسی

میں تحریر کی، علاوہ ازیں اسنادِ حدیث اور اسماء الرّجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور لمعات کے مقدمے کے ذریعے بھی عُلومِ حدیث کا ایک جامع تعارف کرا دیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حدود سے باہر ہے تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دورِ جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انہوں نے حضرتِ مجدّدؒ اور شیخ محدّثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیّت کی تمہید تھے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرت مجدّد نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو ازسرِنو ایک مستحکم داخلی تشخّص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر اُمّت کے خلاف اُٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا اور حضرت مجدّدؒ نے "ردِ روافض" سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ" اور ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیزؒ نے "تحفۂ اثنا عشریہ" ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی ——— اور دوسری طرف شیخ محدّثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمین ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیث نبوی کا ایک عظیم الشّان چمن بنا دیا عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبد الحق محدّث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں۔ اسی طرح امام الہندؒ نے موطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوّی) اور ایک فارسی میں لکھی (المصفّٰی)، واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک موطا امام مالکؒ کو علمِ حدیث کے ذیل میں اصلِ اوّل کی حیثیّت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی

نشاۃِ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطۂ آغاز ان ہی کی ذاتِ گرامی ہے:

مثلاً ایک یہ کہ علمِ فقہ کے میدان میں ایک طرف آپؒ نے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" تصنیف فرمائی جس سے تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" ایسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دور رس نتائج پیدا کیے۔

دوسرے یہ کہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کے ذریعے آپ نے حکمتِ دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادات اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک طرف قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ اس پر انہیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کی تصنیف کے ذریعے علمِ تفسیر کو ایک چیستاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کے بامحاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والدِ مرحوم کے شروع کیے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج برِصغیر پاک و ہند میں علم و فہمِ قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہمہ ہے وہ سب دہلی کے اسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں۔

الغرض ولیسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا علمی اصلاح و تجدید کا پورا کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابلِ قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مساعی کو عالمِ اسلام میں یورپ کی پوری تحریکِ احیاء العلوم (RENAISSANCE) کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان کا عظیم ترین

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

منشورِ اسلام

یعنی اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریۂ زندگی کی حیثیت سے جو آخر کار لازماً پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

یہ (کفّار اور مشرکین) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نُور کو اپنے مونہوں (کی پھونکوں) سے بجھا دیں۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پُورا کیے بغیر نہیں رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی بُری کیوں نہ لگے

اللہ ہی تو وہ ذات ہے جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق (سچّے نظریۂ حیات) کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اس دینِ حق کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکوں کو کتنی ہی ناخوشی کیوں نہ ہو۔

سورۂ توبہ آیات ۳۲، ۳۳

تعارف

عالمی معاملات میں موجودہ بحران، جس کی وجہ سے تہذیب کی کامل بربادی کا ہی نہیں بلکہ نسلِ انسانی کی مکمل تباہی کا خطرہ بھی لاحق ہو گیا ہے، نوعِ انسانی کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اس کا علاج دریافت کرے۔ حال ہی میں انہیں مذہب سے یکایک از سرِ نو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ کیا اگر مذہب کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو وہی انسانوں کے لیے ان خطرات اور مصائب سے محفوظ رہنے کے لیے واحد پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے جو آج ان کے سروں پر منڈلا رہے ہیں؟

دوسری طرف مسلمان ساری دنیا کے سامنے علی الاعلان اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ صرف اسلام ہی وہ نظریۂ حیات ہے جو نسلِ انسانی کو مستقل اور مکمل طور پر متحد کر سکتا ہے۔ دنیا میں پائدار امن و امان قائم کر سکتا ہے اور انسان کو اس کے ذہنی، اخلاقی، مادّی اور روحانی ارتقاء کی اس انتہائی منزل تک پہنچا سکتا ہے جسے پا لینے کی صلاحیت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔

لہٰذا قدرتی طور پر مسلمانوں کے اُوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو بتائیں کہ اسلام کیا ہے؟ اسلام اور دوسرے مذاہب میں فرق کیا ہے؟ اسلام کے دعاوی کی عقلی اور علمی بنیادیں کیا ہیں؟ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور وہ ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے کیا ذرائع اختیار کرتا ہے؟

"منشورِ اسلام" انہی سوالوں کے مختصر جوابات پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔

لفظ "مینی فیسٹو" (منشور) عموماً کسی بادشاہ یا مملکت یا منظّم انسانی جماعت کی طرف سے کسی ایسے اعلان کے معنی میں مستعمل ہوتا رہا ہے جس کی رُو سے عوام کو یہ بتانا مقصود ہو کہ ماضی میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے گئے ہیں اور آئندہ جن کارناموں کے انجام دینے کا اعلان کیا جا رہا ہے، ان کی تفصیلات اور وجوہات کیا ہیں؟ لیکن گذشتہ سو سال سے یعنی جب سے "کمیونسٹ مینی فیسٹو" اشتراکیت کی عالمگیر تبلیغ کے آلۂ کار کی حیثیت سے شائع ہوا ہے (جس کے نتیجہ کے طور پر یہ نظریۂ حیات اب فی الواقع دنیا میں ایک عظیم سیاسی طاقت کی شکل میں رونما ہو گیا ہے) اس لفظ کو یہ نیا مفہوم حاصل ہو گیا ہے

وہ ایک ایسے تحریری اعلان پر وکالت کرنے لگا ہے جو عالمگیر قبولیت کی تمنّا رکھنے والے ایک نظریۂ حیات کی تاریخی بنیادوں، اساسی اصُولوں اور متوقع کامیابیوں کی تشریح کرتا ہو۔ میں نے اس لفظ کو اسی مؤخرالذکر معنی میں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے والوں پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے بنیادی اصُولوں کی تشریح کی حیثیت سے اس کا موضوع تاریخ کے ایک ایسے نظریہ کی صورت اختیار کرتا ہے جو فطرتِ انسانی کے ایک تصوّر پر مبنی ہے۔ جس کی رُو سے اسلام مستقبل کا وہ آخری اور عالمگیر نظریۂ حیات قرار پاتا ہے جو ناگزیر طور پر دنیا کے کناروں تک پھیل کر رہے گا۔ فطرتِ انسانی کے اس تصوّر کی مرکزی حقیقت یہ ہے کہ کسی نصب العین کی محبت کا جذبہ انسان کے تمام اعمال کی (حتیٰ کہ اُن اعمال کی بھی جو بظاہر اس کی حیوانی جبلّتوں کے منبع سے سرزد ہوتے ہیں) واحد حقیقی اور بنیادی قوّتِ محرکہ ہے اور یہ جذبہ ایک ایسے نصب العین کی محبّت سے ہی مکمل اور مستقل طور پر مطمئن ہو سکتا ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو۔

یہ حقیقت مارکس کے بنیادی فلسفہ سے ہی متصادم نہیں ہوتی بلکہ فرائڈ، ایڈلر، اور میک ڈوگل کے ان نفسیاتی نظریات سے بھی متصادم ہوتی ہے جن کو عصرِ حاضر میں بالعموم فطرتِ انسانی کے معیاری اور صحیح نظریات سمجھا جاتا ہے۔ اگر منشورِ اسلام کے پڑھنے والے اُن حقائق کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جاننا چاہتے ہوں جو ان تمام نظریات کے بالمقابل اس حقیقت کی سچّائی کو (اور اس سے اخذ کیے ہوئے دوسرے فلسفیانہ تصوّرات کی سچائی کو بھی جو اس منشور میں زیرِ بحث آئے ہیں) تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ میری انگریزی کتاب "مستقبل کا نظریہ حیات" (IDEOLOGY OF THE FUTURE) ملاحظہ فرمائیں (شائع کردہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب، کشمیری بازار لاہور)

محمد رفیع الدّین

اسلام کیا ہے؟

اسلام کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اسلام اس نظریہ حیات کا نام ہے جس کی تعلیم انبیاء کرام علیہم السّلام ابتدائی زمانہ سے دیتے رہے ہیں۔ دنیا کے تمام خطّوں میں بے شمار انبیاء وقتاً فوقتاً

ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں تاکہ نوع انسانی کے تمام حصّوں کو اُن کے زمانہ کے حالات، ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی ارتقا کے مقامات کے مطابق اس نظریۂ حیات کی تعلیم دیں۔

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ط (۳۵-۲۴)	اور کوئی اُمت (قوم) ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ط (۴۰-۷۸)	اور ہم نے تم سے پہلے (بہت سے) پیغمبر بھیجے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات تم سے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات بیان نہیں کیے

ان انبیاؑ کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے زیادہ کیا گیا ہے اور چونکہ ان سب کی دعوت بنیادی طور پر یکساں رہی ہے اس لیے ہر نبی نے اپنے پیش رو انبیاء کی صداقت کی گواہی دی ہے اور اپنے بعد آنے والے نبی کے ظہور کی پیش گوئی کی ہے۔ بہرحال چونکہ حضرت محمدؐ کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کی مثال میں تمام انبیاء کی دعوت کی نظری تلقین اور انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر (جن میں ان کی زندگی کے عمرانی، اقتصادی، سیاسی اور فوجی شعبے بھی شامل ہیں) اس کا عملی اطلاق دونوں اپنے کمال کو پہنچ گئے ہیں لہٰذا آپ بجا طور پر آخر الانبیاء قرار پائے ہیں اور "اسلام" کی اصطلاح بھی آپ ہی کی تعلیمات کے لیے جو قرآن اور سنّت کے اندر موجود ہیں مخصوص ہو گئی ہے۔ چونکہ تمام انبیاء کی تعلیم بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی جو خدا کی ذات ہے ایک ہی ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ جو شخص گذشتہ انبیا میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ سچّا مسلمان نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	(متقی یعنی سچّے مسلمان) وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپؐ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا (۲-۴)
قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ	(مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر اُتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۲-۱۳۶)

اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو کچھ اور پیغمبروں پر ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اس پر (ہم ان سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ) کے فرمانبردار ہیں۔

اسلام کی روح

اگر تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ لفظ "محبّت" ہے اسلام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ محبّت کریں اور اپنی محبت کو جس قدر زیادہ پاکیزہ یکسو خالص، بے لوث اور صمیم قلب سے صادر ہونے والی بنا سکتے ہیں بنائیں اور پھر ان کی محبّت ایسی ہو کہ وہ ہمیشہ عظیم سے عظیم تر، کمال پاکیزگی اور خلوص کی جانب بڑھتی رہے اور اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کسی کمی، کمزوری یا مایوسی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

اسلام کی ضرورت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبوّت کا ظہور درحقیقت کارخانۂ قدرت میں کسی مقصد کو پورا کرتا ہے؟ کیا انسان کو واقعی اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے کامل دائمی اور مخلصانہ محبّت کی تربیّت اور ترقی کا وہ طریقہ سکھایا جائے جس کی تعلیم انبیاء دیتے چلے آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک کامل، پائدار اور مخلصانہ محبّت ——— جو ایک نصبُ العین کے حصول کی والہانہ شکل اختیار کرتی ہے۔ انسان کی تمام فطری خواہشات میں سب سے زیادہ طاقتور ہے اور سب خواہشات پر غالب آنے والی خواہش ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خواہش چونکہ انسان کی تمام دوسری خواہشات کو اپنے تابع رکھتی ہے یوں کہنا چاہیے کہ وہ دراصل اس کی فطرت کی ایک ہی خواہش ہے اور انسان اسی خواہش سے عبارت ہے اور نبوّت کی اہمیّت یہ ہے کہ صرف وہی انسان کی اس خواہش کی صحیح مکمل اور مستقل تشفی

کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا نبوّت کا عالمِ فطرت میں ایک خاص مقصد ہی نہیں، بلکہ وہ کارخانۂ قدرت کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ناگزیر ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ط

(۳۰-۳۰)

پس (اے پیغمبر) آپ دین (یعنی توحید اور اس کے متضمنات) پر یکسوئی سے قائم رہیے یہ (دین) انسان کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت میں کوئی ردّوبدل ممکن نہیں (لہٰذا) یہی دین پائدار ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔

انسانی فطرت کا تجزیہ: انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے، انسان کی نچلے درجہ کی خواہشات

فطرتِ انسانی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے ہیں۔

اوّل: وہ خواہشات جو بحیثیّت حیوان، انسان کی فطرت سے صادر ہوتی ہیں اور جنہیں انسان کی جبلّتی خواہشات کہا جاتا ہے۔ مثلاً خوراک کی خواہش، جنسی رابطہ کی خواہش۔ مخالف سے مقابلہ کرنے اور راستہ سے ہٹانے کی خواہش۔ ان جبلّتی خواہشات کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(ا) یہ خواہشات انسان اور اُن حیوانات میں مشترک ہیں جو درجۂ ارتقاء میں اس سے فروتر ہیں۔ مثلاً گائے، گھوڑا، اونٹ وغیرہ۔

(ب) ان خواہشات میں ایک داخلی حیاتیاتی دباؤ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے حیوان ان کی تسکین کی جستجو پر مجبور ہوتا ہے۔

(ج) ان خواہشات کی تسکین سے ایک خاص قسم کی مسرّت یا آسودگی حاصل ہوتی ہے۔

(د) ان کی تسکین حیوان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی صحت اور اپنی جسمانی نشوونما کو

برقرار اور اپنی زندگی اور نسل کو محفوظ رکھے۔

انسان کی بلند تر درجہ کی خواہشات

دوئم : وہ خواہشات جو بحیثیّت انسان، اس کی فطرت سے سرزد ہوتی ہیں۔ انکی تفصیل یہ ہے:

(ا) نصب العین کی خواہش۔

(ب) اخلاقی عمل کی خواہش۔

(ج) حصول علم کی خواہش۔

(د) فنی تخلیق کی خواہش۔

ان خواہشات کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) یہ خواہشات انسان کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں دوسرے حیوانات اسکے ساتھ شریک نہیں۔ حیوان اور انسان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک حیوان صرف جانتا ہے، محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے۔ لیکن ایک انسان صرف جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہی نہیں بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جان رہا ہے، محسوس کر رہا ہے اور سوچ رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک حیوان صرف ذی شعور ہوتا ہے مگر ایک انسان خود شعور بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے حیوان اور انسان کی فطرتوں میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ وہ خواہشات جو انسان سے خاص ہیں اس کی خود شعوری یا خودی کی خواہشات ہیں۔

(ب) ان خواہشات سے کوئی حیاتیاتی اضطرار وابستہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ وہ آزاد خواہشات ہیں جو فقط زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تشفی کا راستہ جبلّتوں کی طرح حیاتیاتی اعتبار سے معین نہیں ہوتا۔

(ج) ان میں سے ہر خواہش کی تشفی سے ایک خاص قسم کی مسرّت حاصل ہوتی ہے جو اپنی بہترین اور بلند ترین حالت میں اپنی کیفیّت اور شدّت کے لحاظ سے اس مسرّت سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جو انسان کو جبلّتی خواہشات کی تشفی سے حاصل ہوتی ہے۔

(د) جب یہ اپنی بہترین اور بلند ترین صورت میں ہوں تو ان کی تشفی خود ان کی خاطر ہی عمل میں لائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور محرک یا مقصود نہیں ہوتا۔

(۵) ان کا مقصد حسن کی جستجو ہوتا ہے۔ مثلاً نصب العین کی محبّت ہی کو لیجئے۔ نصب العین ایک ایسا تصوّر ہوتا ہے جس کی طرف انسان وہ سارا حسن منسوب کرتا ہے جو اس کے خیال میں آسکتا ہے۔ اسی طرح سے اخلاقی فعل یا نیکی حسن کے عملی اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور علم کی خواہش درحقیقت صداقت یا سچائی کی خواہش ہے اور صداقت ایک ایسی چیز ہے جسے ہم سراہتے اور پسند کرتے ہیں یعنی جس کی طرف ہم حسن کو منسوب کرتے ہیں اور فن یا آرٹ کسی واسطہ کے ذریعہ سے حُسن کے اظہار ہی کا نام ہے۔

آرٹ کی ایک عام قسم

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فن یا آرٹ اینٹ، پتھر، آواز، صدا، رنگ، لفظ یا حرکت میں حسن کا اظہار ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ ایک ایسا مشغلہ سمجھ لیا گیا ہے جس میں صرف وہ چند افراد ہی حصّہ لے سکتے ہیں جنہوں نے اس غرض کے لیے خاص طور پر تربیت حاصل کی ہو یا جن کو اس مشغلہ کے لیے قدرت کی طرف سے ایک خاص ملکہ عطا ہوا ہو۔ لیکن آرٹ کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں تمام انسان مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں اور وہ طرز بود و باش میں حسن کا اظہار ہے مثلاً جب ہم اپنے مکان کے بنانے اور سجانے میں، اپنے لباس میں، اپنی رفتار و گفتار میں، کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں، اپنے مادی ماحول کی تخلیق میں اور اپنے تمام کاموں میں ظاہری طور پر حسن کا اظہار کرتے ہیں تو ہم ایک قسم کے آرٹ میں حصّہ لے رہے ہوتے ہیں۔

نصب العین کی خواہش انسان کی تمام دوسری خواہشات پر حکمران ہوتی ہے

نصب العین کی خواہش انسان کی ان تمام خواہشات پر حکومت کرتی ہے جو اس کی زندگی کی نفسیاتی سطح سے تعلّق رکھتی ہیں اور جن کا ذکر معاً اوپر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ان خواہشات میں سے کوئی اپنی اصلی حالت میں اس بڑی خواہش کے تقاضوں کے مطابق نہ ہو تو وہ اس کو بدل کر ان تقاضوں کے مطابق کر لیتی ہے۔ اُوپر عرض کیا گیا تھا کہ اپنی اصلی حالت میں ان خواہشات میں سے ہر خواہش صرف اپنی ہی تشفی چاہتی ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد (مثلاً کسی دوسری خواہش کی خدمت یا اعانت) نہیں ہوتا۔ لیکن جب نصب العین پُوری طرح سے حسین نہ ہو تو پھر ان میں سے کوئی خواہش بھی اپنی اصلی حالت میں

اس کے مطابق نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں نصب العین کی خواہش ان میں سے ہر ایک کو بدل کر اپنے مطابق کر لیتی ہے اور یہ تبدیلی غیر شعوری طور پر عمل میں آتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ اس نے ان خواہشات کو اپنے اصلی راستہ سے ہٹا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نصب العین کے چاہنے والوں کا ضابطہ اخلاق اور علم اور آرٹ الگ ہوتا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی یا جمالیاتی سطح کی خواہشات پر کیوں حکمران ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان وہ سارا حُسن جس کی تمنّا اس کی فطرت کے ایک تقاضا کے طور پر اس کے دل میں ہوتی ہے اپنے نصب العین کی طرف منسُوب کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ دیکھے کہ اس کی کوئی خواہش اس حُسن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تو جب تک وہ اس کو بدل کر اس حُسن کے مطابق نہ کرے وہ اسے نہ تو اسے حُسن سمجھ سکتا ہے اور نہ درست۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ نصب العین کی خواہش انسان کی نفسیاتی اور جمالیاتی خواہشات پر ہی نہیں بلکہ اس کی جبلّتی خواہشات پر بھی حکمران ہے۔ ایک حیوان کے لیے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی جبلّتی خواہش کے دباؤ کو روک سکے۔ اس کے برعکس انسان اپنی کسی جبلّتی خواہش کی تشفی اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نصب العین اجازت نہ دے اور وہ اپنی ہر جبلّتی خواہش کی تشفی صرف اسی حد تک کرتا ہے جس حد تک اس کا نصب العین اجازت دیتا ہو۔ جب ایک انسان کا نصب العین یہ تقاضا کرتا ہو کہ وہ اپنی زندگی کو قائم رکھے، تو وہ اس کو قائم رکھنے کے لیے اپنی جبلّتی خواہشات کی مناسب تشفی کے لیے پوری کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب نصب العین کا تقاضا یہ ہو کہ انسان اپنی زندگی کو اس کی حفاظت کے لیے قربان کر کے شہید ہو جائے تو وہ جبلّتی خواہشات کی تشفی سے ہی نہیں بلکہ خود زندگی سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اُسے قربان کرنے کے لیے بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جو ان لاتعداد واقعات کی تشریح کرتی ہے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنے نصب العین کی خاطر یہ جانتے ہوئے زندان میں جانا قبول کر لیا ہے کہ وہاں اُسے اپنی جبلّتی ضروریات کو روکنا یا ترک کرنا پڑے گا یا اُسے سخت قسم کی بدنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنے کے سوائے چارہ نہ ہوگا یا فلاں شخص نے نصب العین کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا ہے یا دار پر چڑھنا یا میدان جنگ میں گولی کھا کر مر جانا قبول کر لیا ہے۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ انسان بالآخر اور درحقیقت صرف ایک ہی خواہش رکھتا ہے اور وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی باقی ماندہ تمام نفسیاتی یا جبلتی خواہشات اس ایک خواہش کے تابع اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ یہی ایک خواہش اس کے تمام اعمال و افعال کی اصلی اور بنیادی قوّت محرکہ ہوتی ہے اور اس کی فطرت کی کوئی اور قوّت اس کے کسی عمل یا فعل کو پیدا نہیں کرتی۔ یہی خواہش فطرت انسانی کا وہ طاقتور اور زبردست جذبۂ عمل ہے جس کو فرائڈ نے غلطی سے جنسی محبّت کا جذبہ سمجھا ہے۔ جسے ایڈلر نے نادانی سے قوّت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ہے۔ جس پر میکڈوگل کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ انسان کی جبلتی یا حیوانی خواہشات کے ایک پُراسرار مرکب کا جذبہ ہے اور جسے کارل مارکس نے بلا دلیل یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(جاری ہے)

ٹیلی ویژن پروگرام "الھدیٰ"

کی ویڈیو اور آڈیو کیسٹس کی تلاش ہے

جن حضرات کے پاس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ٹیلی ویژن پروگرام الھدیٰ کی مکمل یا بعض اقساط ویڈیو (VIDEO) یا آڈیو (AUDEO) کیسٹس کی صورت میں موجود ہوں اُن سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں مطلع فرمائیں۔ ہم ممنون ہوں گے اگر وہ ہمیں یہ کیسٹس عاریۃً دے سکیں ہم ان کیسٹس کی کاپیاں بنوا کر بحفاظت انہیں واپس کر دینگے (ان شاء اللہ) اور اگر وہ پسند کریں تو اس تعاون پر ہماری طرف سے معقول معاوضہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

برائے رابطہ: **نشر القرآن کیسٹ سیریز،** ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴
فون: ۸۵۲۶۸۳ – ۸۵۲۶۱۱

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

آرزوئے حسن اور علم کا باہمی تعلق

اوپر میں نے ایک اصطلاح "علمی حقیقت" استعمال کی ہے اس اصطلاح کا مفہوم واضح کرنے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ علم کی حقیقت کیا ہے اس کے حصول کے لیے خدا نے ہمیں کون سی استعداد بخشی ہے اور وہ کس طرح سے اپنا کام کرتی ہے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ نہ صرف پوری کائنات ایک وحدت ہے بلکہ کائنات کی ہر چیز جسے ہم جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں ایک وحدت ہے یا کم از کم ہم اُسے ایک وحدت کی حیثیت سے ہی جان سکتے ہیں اور کسی حیثیت سے نہیں جان سکتے۔ اگر وہ ایک وحدت نہ بن سکے تو ہم اُسے جان ہی نہیں سکتے اور وہ ہمارے لیے قطعاً بے معنی ہو جاتی ہے۔ ایک وحدت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ معنی خیز ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اُسے جان سکتے ہیں۔ اگر وہ معنی خیز نہ ہو تو نہ وہ ایک وحدت بن سکتی ہے اور نہ ہی ہم اُسے جان سکتے ہیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی وحدتیں مل کر ایک بڑی وحدت بناتی ہیں اور پھر کئی بڑی بڑی وحدتیں مل کر اس سے بھی بڑی وحدت بناتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم سب سے بڑی وحدت یعنی پوری کائنات پر پہنچ جاتے ہیں کوئی بڑی وحدت چند چھوٹی وحدتوں کا ایک مجموعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک کُل (WHOLE) کی صورت میں ہوتی ہے جو ہمیشہ اپنے اجزا یا عناصر سے بڑھ کر ہوتا ہے اور جس کی تشریح یا تفہیم فقط اس کے اجزا یا عناصر سے نہیں ہو سکتی جیسے کہ ایک جسم حیوانی کہ وہ فقط چند اعضا کے مجموعہ کا نام نہیں یا جیسا کہ ایک خوبصورت شاہکار ہنر جس کی دلکشی اس کے اجزا پر نہیں بلکہ ایک مجموعی کیفیت پر موقوف ہوتی ہے جو اجزا کی ترکیب کا ایک پُراسرار نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی وحدت کو جاننے کے لیے قدرت نے جو ہمیں استعداد بخشی ہے، وہ ہماری آرزوئے حسن ہے جسے اقبال عشق بھی کہتا ہے۔ آرزوئے حسن جب جاننے کے کام میں لگی ہوتی ہے تو اسے ہم عام طور وجدان (INTUITION) کا نام دیتے ہیں۔ کسی وحدت کا وجدان ایک احساس یا اعتقاد کی صورت میں ہوتا ہے ہمارا تمام علم

فقط وجدانی تصورات یا اعتقادات کے ایک سلسلہ یا مجموعہ کی شکل اختیار کرتا ہے اور ہمارے علم کے درست یا غلط ہونے کا سارا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اعتقادات درست ہیں یا غلط۔

حواس اور عقل دونوں آرزوئے حسن یا وجدان مددگار ہیں

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ہم حواس یا عقل کے ذرائع سے بھی جانتے ہیں اور اپنی علمی جستجو میں سائنسدان کا دار و مدار زیادہ تر حواس پر ہوتا ہے اور فلسفی کا عقل پر، لیکن دراصل حواس اور عقل دونوں ہماری آرزوئے حسن یا ہمارے وجدان کے مددگار ہیں یہ خود نہ وحدتوں کو جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں بلکہ وجدان ان کی مدد سے وحدتوں کو جانتا ہے اس میں شک نہیں کہ وجدان غلطی بھی کرتا ہے لیکن غلطی کے بغیر جاننا بھی وہی ہے اسی لیے طالبان علم وصداقت کی حیثیت سے اور معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسانوں کی حیثیت سے بھی وجدان کے بغیر ہمارا چارہ نہیں۔

اس وقت میں جس کمرہ میں ہوں وہاں کمرہ کے دوسرے سرے پر میرے سامنے دُور سبز رنگ کی ایک دیوار کے ساتھ ایک کرسی پڑی ہے لیکن یہ بات کہ وہ کرسی ہے میرا وجدانی نتیجہ ہے جو ایک احساس یا اعتقاد کی صورت میں ہے۔ میرا مشاہدہ ہرگز نہیں ہے کہ کرسی کو نہیں دیکھ رہا بلکہ رنگ کی ایک کیفیت کو دیکھ رہا ہوں جو میرے وجدان یا اعتقاد کی دخل اندازی کے بغیر بے معنی ہوتی۔ اگر میں کہوں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک کرسی ہے تو یہ بات قطعاً غلط ہوگی لیکن اگر میں کہوں کہ جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس کی بنا پر میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ وہ ایک کرسی ہے تو یہ بات صحیح ہوگی۔ میرا یہ نتیجہ کہ وہ ایک کرسی ہے غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک کرسی نہ ہو بلکہ کرسی کے پیچھے کی سبز دیوار پر ایک ماہر نقاش کا بنایا ہوا نقش ہو۔ اگرچہ میں نے اس کُل یا وحدت پر جسے میں ایک کرسی کہہ رہا ہوں اپنے وجدان یا اپنی آرزوئے حسن کو کام میں لاکر پورا غور و فکر کیا ہے اور اپنی عقل سے اس کی اندر کی چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے باہمی تعلّق کا پُورا جائزہ لیا ہے اور میرا وجدان اس اعتقاد پر پہنچا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی وحدتیں مل کر جس بڑی وحدت کو بناتی ہیں وہ ایک کرسی ہی ہو سکتی ہے ایک نقش نہیں ہو سکتی تاہم غلطی کا

امکان موجود ہے۔ میں پوری کرسی نہیں دیکھ رہا بلکہ صرف کرسی کے اوپر کی اس سطح کو دیکھ رہا ہوں جس کا رُخ میری طرف ہے۔ اور دراصل میں اس سطح کو بھی نہیں دیکھ رہا بلکہ رنگ کی ایک بے معنی کیفیت کو دیکھ رہا ہوں میرا یہ نتیجہ کہ رنگ کی یہ کیفیت کسی کرسی کی سطح کا ایک حصّہ ہے اور پھر یہ نتیجہ کہ یہ کرسی کی سطح کا ایک حصّہ ہی نہیں بلکہ پوری کرسی ہے فقط ایک اندرونی احساس یا اعتقاد ہے جسے پیدا کرنے کے لیے میرے مشاہدہ کی شہادت ناکافی ہے یہی وجہ ہے کہ گو ہمارے حواس اپنا پُورا کام کر رہے ہوتے ہیں ہم بار بار اپنے وجدان کی غلطیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں یہی حال ہمارے تمام حسّی تجربات کا ہے خواہ ان کا ذریعہ دیکھنا ہو یا سُننا یا چکھنا یا سونگھنا یا چھُونا، ان میں سے کوئی بھی میرے وجدان کے بغیر اور ایک وحدت کی صورت اختیار کیے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ قرآن حکیم نے حضرت سلیمان اور ایک سورج پرست ملکہ کا قصہ بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرَ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

اس (سورج پرست ملکہ) کو کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جایئے جب اس نے محل (کے فرش) کو دیکھا تو اُسے گمان ہوا کہ وہ پانی ہے اور اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا سمیٹ لیا (تاکہ بھیگ نہ جائے) حضرت سلیمان نے کہا یہ محل تو شیشہ کا بنا ہوا ہے۔ اس پر ملکہ نے کہا "اے میرے پروردگار میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی ہوں اور میں سلیمان کی طرح اللہ رب العٰلمین پر ایمان لاتی ہوں"۔

رب العٰلمین پر ایمان لانے کے لیے تو حضرت سلیمان کا پیغام پہلے ہی پہنچ چکا تھا ملکہ نے دیکھا کہ کوئی تعجب نہیں کہ جس طرح وہ شیشہ کو پانی سمجھ رہی تھی وہ اپنے معبود حقیقی کے بارے میں بھی غلطی کا ارتکاب کر رہی ہو اور غلطی سے ہی سورج کو خدا سمجھ رہی ہو لہٰذا اس نے فوراً اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

اس قصہ کا ایک مقصد یہ بتانا ہے کہ نبوّت انسان کی عملی زندگی کے لیے بنیادی اہمیّت رکھنے والے حقائق کے بارہ میں انسان کو وجدان کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قدرت کا ایک انتظام ہے۔

عقل کا وظیفہ

جسے ہم عقل کہتے ہیں اس کا کام فقط یہ ہے کہ وجدان جن وحدتوں کو قبول کر چکا ہوتا ہے وہ ان کے باہمی تعلق کا جائزہ لے تاکہ اس تعلق کی روشنی میں وجدان ایک اور بڑی نامعلوم وحدت کو معلوم کرے جو ان معلوم وحدتوں سے مطابقت رکھتی ہو اور جس کے عناصر یا اجزا یہ وحدتیں ہوں یا ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی نامعلوم وحدتوں کو معلوم کرے جو ایک بڑی معلوم وحدت کے اجزا اور عناصر کے طور پر ہوں۔ اوّل الذکر عمل کو ترکیب (SYNTHESIS) اور ثانی الذکر کو تجزیہ (ANALYSIS) کہا جاتا ہے وحدتوں کا باہمی تعلق معلوم کرنے کے لیے عقل ایک وحدت سے دوسری وحدت کی طرف اور دوسری سے تیسری کی طرف اور تیسری سے چوتھی کی طرف جاتی ہے اور ان سب کے باہمی تعلق کو ٹٹولتی ہے۔ عقل کا کام صرف یہ ہے کہ کسی وحدت تک پہنچنے کے لیے ہمارے وجدان کو اکسائے وہ فقط کسی وحدت کے اجزا کے تعلقات پر غور کرتی ہے۔ پوری وحدت کا احساس نہیں کر سکتی۔ وحدت کا احساس یا علم اس کا وظیفہ نہیں۔ جب ہمارا وجدان کسی وحدت کے علم تک پہنچتا ہے تو اس سے بہت پہلے عقل اس سے رخصت ہو چکی ہوتی ہے اور ہمیں پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہوا ہے عقل وہ راستہ دکھاتی ہے جو منزل کو جاتا ہے لیکن خود ہمارے ساتھ منزل پر نہیں پہنچتی۔ منزل پر پہنچنا تمنائے حسن کا کام ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

عقل گو منزلِ عشق سے دُور نہیں رہتی لیکن اس منزل میں داخل نہیں ہو سکتی :

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

اگر یہ کہا جائے کہ آرزوئے حسن یا وجدان کے بغیر وحدتوں کے باہمی تعلقات کا جائزہ لینا مثلاً یہ بتانا کہ نو کا عدد چار سے بڑا ہے ممکن نہیں۔ لہٰذا کیوں نہ یہ کہا جائے کہ عقل آرزوئے حسن یا وجدان کی اس خاص حالت کا نام ہے جب وہ وحدتوں کے درمیان حرکت کر رہی ہوتی ہے تاکہ ان کی باہمی نسبتوں کو دریافت کرے تو اقبال اس سے بھی اختلاف نہیں کرتا اور مانتا ہے کہ عقل بھی عشق ہے اور ذوق حسن سے عاری نہیں لیکن وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ عقل کی فعلیت وحدتوں کے باہمی تعلقات کو ٹٹولنے کے لیے حرکت تک محدود رہتی ہے اس کی جرأت نہیں کہ ایک محب یا عاشق کی طرح کسی وحدت کی وحدت یا زیبائی یا حسن کا مشاہدہ یا مطالعہ کرنے کے لیے رُک جائے اور حسن کے کسی جلوہ پر فدا ہو کر اپنی حرکت کو سکون میں بدل دے۔ چنانچہ اقبال کہتا ہے:

عقل ہم عشق است واز ذوقِ نگاہ بیگانہ نیست
لیکن ایں بے چارہ را آں جرأت رندانہ نیست

جونہی کہ ہم وجدان کے باہمی تعلقات کا جائزہ لینے کی بجائے کسی وحدت کا احساس بطور وحدت کے کرنے لگ جائیں یا محسوس کرنے لگ جائیں کہ ہم کسی علم تک پہنچ گئے ہیں یا ہم نے کسی بات کو جان لیا ہے فوراً ہماری عقل فعلیت موقوف اور ہمارے وجدان کی فعلیت شروع ہو جاتی ہے۔

ایک مثال سے عقل اور وجدان کے باہمی تعلق کی وضاحت

عقل اور وجدان (یا آرزوئے حسن) کے باہمی تعلق پر غور کرنے کے لیے ایک ایسے شخص کو فرض کیجیے جس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو کہ وہ ایک بڑے مکان میں جس سے وہ ایک حد تک آشنا ہے ٹٹولتا ہوا ایک خاص کمرے کی طرف نکل جائے جب وہ اپنے ہاتھوں سے دیواروں، ستونوں، دروازوں، کھڑکیوں، سیڑھیوں اور راستوں کو ٹٹولتا جاتا ہے تو اس بات کا صحیح اور پورا تصور اپنے ذہن میں قائم کرتا جاتا ہے کہ وہ مکان کے کس حصّہ میں پہنچا ہے۔ اُس کے ٹٹولتے ہوئے ہاتھ اسے اپنے ماحول کا صرف ایک حصّہ دکھاتے

ہیں وہ حصّہ جس سے وہ اندھیرے میں چھوتا ہے لیکن اسے مکمل راہ نمائی صرف اپنے تصوّر سے ملتی ہے جو مکان کے ہر حصّہ کی جس میں وہ قدم رکھتا ہے پوری تصویر اس کے سامنے پیش کرتا جاتا ہے عقل (REASON) دراصل اس آدمی کے ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں کی طرح ہے جو اس کے راستہ کے بعض نشانات کا پتہ دیتے ہیں اور وجدان (INTUITION) اس کے تصور کی طرح ہے جو اندر سے اس کے ماحول کا پورا نقشہ اس کے سامنے پیش کر دیتا ہے جس طرح اس پٹی باندھنے والے شخص کے راہ نما تصور کا باعث مکان سے اس کی سابقہ واقفیت ہے اسی طرح سے ہمارے وجدان کا باعث ہماری فطری آرزوئے حسن ہے۔

نفسیات تشاکلی کے متعلق اقبال کی رائے

جرمن ماہرین نفسیات کا ایک مکتب جسے وحدتوں کی نفسیات (GESTALT PSYCHOLOGY) یا نفسیات تشاکلی (CONFIGURATION PSYCHOLOGY) کہا جاتا ہے اس حقیقت کے ثبوت میں نہایت ہی زوردار اور یقین افروز تجرباتی شواہد بہم پہنچاتا ہے کہ خارجی دنیا کے متعلق انسان کا علم وحدتوں کی شکل اختیار کرتا ہے اس مکتبِ نفسیات کا کہنا یہ ہے کہ ذی شعور کردار کے گہرے مطالعہ سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ اس میں معرفت یا پہچان حسّیات کے سلسلہ سے بلند اور بالا ہو کر کام کرتی ہے اس معرفت یا پہچان سے اشیا کے مادی، مکانی یا علتی تعلق کے بارہ میں شعور کا علم یا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی انسانی شعور مختلف اشیاء کے ایک بے ترتیب مجموعہ سے بعض اشیاء کو جو اس کے مقصد کے پیشِ نظر ایک وحدت بناتی ہیں چُن لیتا ہے اس مکتب نفسیات کے متعلق اقبال لکھتا ہے:۔

> "تاہم اس خیال سے کچھ اطمینان ہوتا ہے کہ شاید جرمنی کا نیا مکتبِ نفسیات جسے نفسیات تشاکلی کہا جاتا ہے نفسیات کو ایک آزاد اور مستقل علم کی شکل دینے میں کامیاب ہو جائے اور اسی طرح سے شاید ابداعی ارتقا (EMERGENT EVOLUTION) کا نظریہ بھی آخر کار حیاتیات کی آزادی اور استقلال کا باعث بن سکے۔"
>
> کردار یت (BEHAVIOURISM) اور منطقی اثباتیت

اور اس قسم کے دوسرے سطحیت پسند فلسفے جو فلسفہ کے اس عالمگیر انحطاط کے دَور میں حشرات الارض

کی طرح پیدا ہو رہے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ ان کے منکرین شعور موجدوں اور مبلغوں کی نگاہ ابھی تک انسان کے حسّی تجربات کی وجدانی اور مابعد الطبیعاتی بنیاد پر نہیں پڑی۔

چونکہ ہمارے وجدان کا باعث ہماری آرزوئے حسن ہے اقبال نے وجدان کو عشق اور جنون اور نظر وغیرہ ناموں سے بھی تعبیر کیا ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

زمانہ ہیچ نداند حقیقت اورا ——
جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است

سائنس اور وجدان

جب سائنسدان کے پاس نام نہاد "مشاہداتی حقائق" (OBSERVED FACTS) (جن کو درحقیقت ہمارا وجدان صورت پذیر کرتا ہے) کی کچھ تعداد فراہم ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ ان کی تشریح کے لیے بالفاظ دیگر ان کو منظم کر کے ایک وحدت بنانے کے لیے اُسے ایک مفروضہ (HYPOTHESIS) یا نظریہ (THEORY) کی یا ایک وجدانی یا اعتقادی تصور کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اس قسم کا ایک وجدانی مفروضہ ایجاد کرتا ہے اگر یہ مفروضہ جو درحقیقت مابعد الطبیعات کی دنیا سے لایا جاتا ہے فی الواقع ان تمام حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو یعنی ان کو منظم کر کے ایک وحدت بناتا ہو تو وہ مفروضہ

بھی جب تک کہ ان حقائق کی معقول تشریح کر رہا ہو ایک ایسی ہی قابل یقین حقیقت شمار کیا جاتا ہے جیسی کہ کوئی اور علمی حقیقت جس کو سائنسدان مشاہدہ قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت سائنسدانوں کے اپنے لفظ نظر کے مطابق کبھی مشاہدہ میں نہ آئی ہو کیونکہ اس صورت میں کوئی دوسرا مفروضہ ان حقائق کی تشریح نہیں کر سکتا اور اس مفروضہ کی جگہ نہیں لے سکتا گویا سائنسدان ایک غائب چیز کی موجودگی پر اس کے نتائج و اثرات کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے یہی ایمان بالغیب ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔

ویومنون بالغیب (وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں)

وجدانی مفروضات کی ضرورت

سائنسدان پر ہی موقوف نہیں۔ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں مفروضات ایجاد کرتے رہتے ہیں یعنی بعض تصورات پر ایمان بالغیب لاتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ "کل سورج طلوع ہوگا" یا یہ کہ "میرا دوست سخی ہے" حالانکہ سورج کا آج طلوع ہونا تو ایک مشاہداتی علم ضرور ہے لیکن اس کا کل طلوع ہونا محض ایک مفروضہ ہے جس پر ایمان لا کر ہم اپنے بہت سے کام کرتے ہیں۔ اس طرح سے میرے دوست نے آج تک سخاوت کے بہت سے کام کیے ہوں گے لیکن میرا یہ علم کہ سخاوت اس کی طبیعت کا ایک جزو ہے اور وہ آج کے بعد بھی کوئی سخاوت کا کام کرے گا مشاہداتی علم ہرگز نہیں بلکہ ایک مفروضہ یا وجدانی علم ہے ہماری ساری عملی زندگی کا دارومدار اسی قسم کے غائب از نظر مابعد الطبیعاتی یا وجدانی حقائق پر ہے۔ مابعد الطبیعات ہماری عملی زندگی کی جان ہے اس کے بغیر ہم اپنی زندگی کے راستہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے بعض لوگوں کو مابعد الطبیعات سے خواہ مخواہ نفرت ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عملی زندگی مشاہداتی یا معروضی حقائق پر مبنی ہے۔ حالانکہ اگر ان کی عملی زندگی سے مابعد الطبیعات کو ایک لمحہ کے لیے بھی الگ کر دیا جائے تو ان کی بیشتر حرکات و سکنات یک دم موقوف ہو جائیں۔ ہر وہ حقیقت جس پر ہم یقین کرتے ہیں شروع میں ایک مفروضہ ہی ہوتی ہے پھر جوں جوں نئے نئے حقائق منکشف ہو کر اس مفروضہ کی تائید کرتے جاتے ہیں وہ مفروضہ ہمارے لیے ایک حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس پر ہمارا الیقین حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر حقائق جو آشکار ہوتے جاتے ہیں اس مفروضہ کی تائید نہ کریں تو ہم اس مفروضہ کو غلط سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں اس قسم کی ناقابل

انکارِ حقیقت کی ایک مثال جس پر سائنسدان ایمان بالغیب رکھتا ہے "ایٹم" ہے جس کے اندرونی نظام کو آج تک دیکھا نہیں گیا "ایٹم" کو ایک مفروضہ کے طور پر آج سے صدیوں پہلے پیش کیا گیا تھا لیکن ان کئی صدیوں میں ہم نے ایٹم کے نتائج و اثرات کا یعنی ان وحدتوں کا جن کو ایٹم کا وجدانی تصور جوڑ کر ایک نئی وحدت بناتا ہے۔ جو تجربہ کیا ہے اس نے ایٹم بم کو آج ایک ناقابلِ انکار علمی حقیقت بنا دیا ہے اور اس حقیقت کا علم یہاں تک مؤثر ہے کہ ہمیں ناگاساکی اور ہیروشیما کو آن واحد میں تباہ کرنے پر قادر بنا سکتا ہے۔ سائنسدان ایک مفروضہ کو جو اس کے مشاہداتی حقائق کی معقول تشریح کر رہا ہو اپنے مشاہداتی حقائق سے کم درجہ کی علمی حقیقت نہیں سمجھ سکتا۔ وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشاہداتی حقائق تو سائنس ہیں لیکن یہ مفروضہ جو ان کو منظم کرتا ہے یا ان کی تشریح کرتا ہے سائنس نہیں بعض وقت الگ تھلگ مشاہداتی حقائق سے زیادہ یہ مفروضہ اس کے کام آتا ہے کیونکہ اس کو اپنی تحقیق اور تجسس کو جاری رکھنے کے لیے اور نئے نئے مشاہداتی حقائق کو سمجھنے کے لیے ایک بنیادی یا راہ نما تصوّر کا کام دیتا ہے اور اس مفروضہ کے بغیر اس کے مشاہداتی حقائق بھی کوئی زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

سائنس اور فلسفہ کا باہمی تعلّق

سائنسدان وجدانی مفروضات ایجاد کرنے کی جو ضرورت محسوس کرتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی وحدتیں مل کر ایک بڑی وحدت بناتی ہیں اور ہم کائنات کی فطرت اور اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ حقائق کو وحدتوں ہی کی صورت میں جانیں اور سمجھیں۔ ضروری ہے کہ ہماری یہ مجبوری سائنسدان کو زود یا بدیر ایک ایسے مرحلہ پر پہنچا دے جہاں اس کے دریافت کیے ہوئے حقائق کی تشریح ایک ایسے مفروضہ یا ایک ایسے وجدانی یا اعتقادی تصوّر ہی سے ہو سکتی ہو جو پوری کائنات کے حقائق کو متحد اور منظم کرتا ہو اور جب سائنسدان اس مفروضہ سے حقائق کائنات کی تشریح کرنے لگ جائے تو خواہ ہم اسے سائنسدان کہیں یا فلسفی دونوں صفات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ فلسفی بھی سائنسدان کے بہم پہنچائے ہوئے حقائق کی تشریح ایک ایسے وجدانی تصوّر سے کرتا ہے جو اس کے خیال میں پوری کائنات کے حقائق کو ایک وحدت بناتا ہے خواہ اس کا یہ تصوّر روحانی ہو یا مادّیاتی ان مفروضات سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ دراصل سائنسدان اور فلسفی میں کوئی فرق

نہیں دونوں کے کام کا دائرہ ایک ہی ہے اور دونوں کی علمی تحقیق اور تجسّس کا دارومدار بھی انسان کی ایک ہی استعداد پر ہے جسے ہم وجدان کہتے ہیں۔

سائنس کو اپنی ترقی کی انتہاؤں پر پہنچ کر فلسفہ بننے کے بغیر چارہ نہیں رہتا کیونکہ اگر وہ اس مرحلہ پر فلسفہ نہ بن سکے تو بے معنی ہو جاتی ہے۔ اتفاقاً اس بیسویں صدی میں سائنس اپنی ترقی کی ان انتہاؤں پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے فلسفہ بننے کے بغیر چارہ نہیں۔ جہاں اس کے دریافت کیے ہوئے علمی حقائق کی تشریح ایک ایسے وجدانی یا اعتقادی تصوّر سے ہی ہو سکتی ہے جو پوری کائنات کے حقائق کو متحد اور منظم کرتا ہو۔ ہم مانتے ہیں کہ تخلیق کی تین سطحیں ہیں۔ مادہ کی دنیا، حیوانات کی دنیا اور انسانوں کی دنیا ان کے بالمقابل علم کے بھی تین ہی بڑے شعبے ہیں طبیعات، حیاتیات اور نفسیات اس صدی میں جو طبیعاتی حقائق دریافت ہوئے ہیں انہوں نے ماہرین طبیعات کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی تنظیم اور تشریح کے لیے یہ وجدانی تصور یا اعتقاد ایجاد کریں کہ کائنات کی آخری حقیقت شعور ہے کیونکہ یہ تصور کہ کائنات کی حقیقت مادی ہے جسے اب تک سائنسدان قبول کر رہے تھے، ان نئے طبیعاتی حقائق کی تشریح کرنے سے قاصر ہے اس وجدانی تصوّر یا اعتقاد کو واضح کرنے کے لیے ایڈنگٹن (EDDINGTON) اور جیمز جینز (JAMES JEANS) ایسے ماہرین طبیعات نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بظاہر طبیعات کی کتابیں ہیں لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ فلسفہ کی کتابیں نہیں ہیں اسی طرح سے اس صدی میں جو حیاتیاتی حقائق منکشف ہوئے ہیں انہوں نے ماہرین حیاتیات کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کی تشریح اس مفروضہ یا اعتقاد سے کریں کہ کائنات کی حقیقت شعور ہے مادہ نہیں۔ اس نظریہ کی تشریح کے لیے جے۔ ایس ہالڈین (HALDANE) نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہی حیاتیات کی فلسفیانہ بنیاد (PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY) ہے۔ اور پھر اس وقت نفسیات کے میدان میں جو حقائق منکشف ہو رہے ہیں وہ بھی شعور کی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ بات نہایت ہی تسلی بخش ہے کہ ماہرین طبیعات، حیاتیات اور نفسیات ایسے حقائق کا انکشاف کر رہے ہیں جن کی معقول اور یقین افروز تشریح کے لیے خدا کے تصوّر کے علاوہ کوئی دوسرا تصوّر کام نہیں دے سکتا اگرچہ اس تصوّر کے خلاف اہل مغرب فی الحال ایک دیرینہ علمی تعصّب میں مبتلا ہیں۔

سائنسی نظریات کے تغیّر کی سمت

فلسفیوں اور سائنسدانوں کے نظریات کا بدلنا نہایت مفید اور اہم ہے۔ کیونکہ وہ بدل بدل کر درستی کی طرف آتے رہتے ہیں جب نئے علمی حقائق دریافت ہوتے ہیں اور کوئی نظریہ جو پرانے علمی حقائق کی تشریح اور تنظیم کے لیے پہلے کافی سمجھا گیا تھا ان کی تشریح اور تنظیم کے لیے کفایت نہیں کرتا تو فلسفی اور سائنسدان دونوں مجبور ہوتے ہیں کہ اس کی جگہ دوسرا نظریہ قائم کریں جو تمام نئے اور پرانے علمی حقائق کی تسلّی بخش تنظیم اور تشریح کرتا ہو۔

اس کی مثال روشنی کا نظریۂ امواج ہے جسے سب سے پہلے ۱۶۶۵ء میں ہوک (HOOKE) نے پیش کیا تھا بعد کی دو صدیوں میں یہ نظریہ ان تمام حقائق کی کامیاب تشریح کرتا رہا جو اس کے سامنے آتے رہے حتّٰی کہ ۱۹۱۴ء تک بھی یہ نظریہ ان حقائق کی معقول تشریح کر رہا تھا جو فان لائے (VON LAUE) نے روشنی کی ایکس شعاعوں کے متعلق دریافت کیے تھے اور جن کی دریافت پر اس سائنسدان کو نوبیل (NOBEL) کا انعام دیا گیا تھا لیکن ۱۹۳۲ء میں جب اسے انعام حاصل کیے ہوتے ابھی نو ہی سال گزرے تھے یہ نئی علمی حقیقت سامنے آئی کہ ایکس شعاعیں منتشر ہو جاتی ہیں اور یہ حقیقت ایسی تھی کہ روشنی کا قدیم نظریۂ امواج اس کی معقول تشریح کرنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا روشنی کا ایک نیا نظریہ ایجاد کیا گیا جسے نظریۂ ذرات یا نظریۂ کوانٹم (QUANTUM THEORY) کہتے ہیں۔ اب یہ نظریہ قدیم اور جدید تمام حقائق علمی کی معقول تشریح کر سکتا ہے اگر ہوک کا وجدان اس قدر تیز یا قوی ہوتا کہ اس کے ذہن میں یہ بات آجاتی یا ہوک (HOOKE) سے بہتر حقائق عالم کا وجدان رکھنے والا کوئی شخص اسے بتا دیتا کہ نور امواج کی صورت میں نہیں بلکہ ذرات کی صورت میں ہونا چاہیئے تو یہ نظریہ روشنی کے متعلق نہ صرف اس وقت کے علمی حقائق کی بلکہ آج تک کے دریافت کیے ہوئے تمام علمی حقائق کی تشریح کے لیے کفایت کرتا۔ تاہم اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ جوں جوں معلوم اور مُسلّم حقائق کی تعداد بڑھتی جاتی ہے حقیقت اشیاء کے متعلق ہمارا وجدانی تصوّر بھی زیادہ سے زیادہ درست ہوتا جاتا ہے اور یہ کہ حقیقت اشیاء کا صحیح تصوّر ہی تمام علمی حقائق کی معقول اور مکمل تشریح کر سکتا ہے اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ضروری ہے کہ ہم حقائق علمی کی ترقی کی وجہ سے بالآخر حقیقت اشیاء کے ایسے وجدانی تصوّر پر پہنچ جائیں جو کامل طور پر صحیح ہو اور جو پوری کائنات کے ان تمام علمی حقائق کی معقول اور کامل طور پر تسلّی بخش تشریح کر سکے جو قیامت تک دریافت ہوتے رہیں۔ (جاری ہے)

تبادلۂ خیال

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر

کے بارے میں

عمان سے گلزار احمد صاحب کا مکتوب بنام مولانا سیّد اخلاق حسین قاسمی

محترم و مکرم جناب اخلاق حسین قاسمی صاحب۔ السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ
اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ "حکمت قرآن" میں آپ کا ایک مختصر سا مضمون "مولانا آزاد بحیثیت مُفسر قرآن" پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چونکہ میں ماہنامہ میثاق اور حکمتِ قرآن دونوں کا باقاعدہ قاری ہوں اس لئے آپ کے کچھ اور مضامین بھی نظر سے گزرے ہیں۔

میں اس بات کی کامل تائید کرتا ہوں کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسا مفسّر قرآن ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ میری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ مولانا کی تفسیر کوئی صاحب علم انسان پایۂ تکمیل تک پہنچاتا اور اس بارے میں میں نے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا تھا لیکن مولانا نے بیماری اور عدیم الفرصتی کی بنا پر معذرت کردی ہے۔

"مولانا آزاد سٹڈی فورم دلی" مولانا آزاد پر کس نوعیت کا کام کر رہا ہے؟ کاش کوئی صاحب علم و فکر مولانا کے کام کو جو وہ قرآن کریم کی تفاسیر کے بارے میں کرنا چاہتے تھے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا!

اللہ تعالےٰ آپ کا حامی و ناصر ہو — مخلص گلزار احمد

مولانا قاسمی مدّظلہٗ کا وضاحتی جواب

"اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا آزاد کی تفسیر کا بقیہ کام کوئی دوسرا ابوالکلام ہی کرسکتا ہے، ہمارے بزرگوں میں دہلی کے مشہور عالم مولانا احمد سعید صاحب

فرمایا کرتے تھے کہ: قرآن کریم کی عربیٔ مبین ابوالکلام آزاد کا انتظار کررہی تھی کہ اسے اردوئے مبین کے قالب میں ڈھالیں، ہندوستانی علماء میں یہ سعادت صرف مولانا آزاد ہی کو حاصل ہوئی ہے،،

قرآن کریم کی تفسیریں اپنے اپنے رنگ میں سب ہی قابل قدر ہیں لیکن ابوالکلام اپنا رنگ اپنے ساتھ ہی لے گئے اور ترجمان القرآن اپنی بہترین یادگار چھوڑ گئے۔

مولانا آزاد سٹڈی فورم ایک رسمی ادارہ ہے جو سال بھر میں ایک دفعہ مولانا آزاد کا جنم دن منا لیتا ہے ـ جو طبقہ سرکاری سطح پر مولانا آزاد کو یاد بھی کرتا ہے تو وہ صرف ان کی سیکولر سیاست کو نمایاں کرتا ہے اور یہاں کے حالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔

مولانا کی قرآن فہمی میں شاہ ولی اللہ کا اجتماعی فکر جلوہ گر ہے۔ اس پہلو سے راقم اسطور مولانا کے تفسیری اقتباسات جمع کر رہا ہے جو مولانا کے دینی فکر کی سربلندی کے ساتھ ادب اُردو کے شاہ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں ـ مولانا علی میاں صاحب کو معذرت کرنی ہی تھی۔ ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور ،،

اخلاق حسین قاسمی

جامعہ رحیمیہ دلی ۲۵ راکتوبر ۸۲ء

بقیہ ' درس سُورہ محمدؐ '

تو ہم برق الغماد تک جا پہنچیں گے (جو یمن کا آخری شہر ہے) اور اس کے لیے ہم اپنی سواریوں کو دُبلا کریں گے۔،،

حضرت سعدؓ بن عُبادہ کی یہ تقریر سُن کر آپؐ کا چہرۂ انور خوشی سے دمک اُٹھا اور آپؐ نے بدر کی جانب کوُچ کا فیصلہ فرما دیا۔ (جاری ہے)

بقیہ: حرفِ اوّل

کی حیثیت سے جو آخر کار لازماً پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا۔" اس چھوٹی کتاب کو بڑی کتاب کا تعارف یا دیباچہ سمجھنا چاہیئے۔

لہٰذا ہم نے ابتدا اسی چھوٹی کتاب یعنی 'منشورِ اسلام' کے ترجمے سے کی ہے۔ واضح رہے 'منشورِ اسلام' اصل کتاب جو انگریزی میں ہے، ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سے ابتدائی ۶۰ صفحات کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے خود اپنی نگرانی میں کرایا تھا۔ جو ۱۹۶۹ء میں بالاقساط 'میثاق' میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے بقیہ صفحات کا ترجمہ محترم ڈاکٹر ابصار احمد کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ جب دونوں کتابوں کا ترجمہ ہو جائیگا تو ان کو کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا جائے گا۔

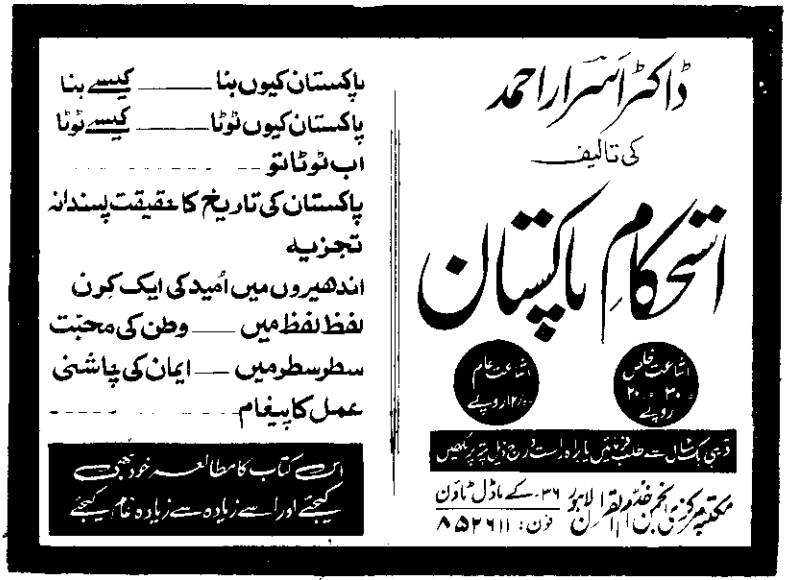

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا — کتنا کتنا حصّہ ہے ؟
سقوطِ مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد — سندھ کیوں جل رہا ہے ؟
پنجابی سندھی کشمکش — مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی ؟

کیا اِس شر میں کچھ خیر بھی ہے ؟

سیاسی محرومیوں، انتظامی بے تدبیریوں، حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل، اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا — بے لاگ تجزیہ

اصلاحِ احوال کی مثبت تجاویز

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا تازہ سلسلہ مضامین

استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

ہر دردمند پاکستانی کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

۱۴۴ صفحات ، سفید آفسٹ کاغذ ، قیمت صرف ۱۵/ روپے

ملنے کا پتہ : ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون : ۸۵۲۶۸۳

FEBRUARY 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT-E-QURAN
LAHORE

VOL. 6
NO. 2

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

ایک نئی تعلیمی سکیم: قرآن کالج

اعلان داخلہ برائے بی اے کلاس

الحمدللہ کہ اس سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی سکیم کا باضابطہ آغاز ہو رہا ہے۔ اس سکیم کے تحت ایف۔ اے/ ایف۔ ایس سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ اور تین سال کے عرصے میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی۔ اے کے امتحان کی باقاعدہ مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تعلیم بھی دی جائے گی جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل، پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہوں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں:

1. ایف اے/ ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
2. داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۶ مارچ ۸۷ء ہے جبکہ داخلہ ٹیسٹ یا انٹرویو ان شاء اللہ اپریل کے مہینے میں ہوگا جس کی معینہ تاریخ سے درخواست دہندگان کو مطلع کر دیا جائے گا۔
3. تعلیم کا آغاز ان شاء اللہ ماہِ رمضان المبارک کے فوراً بعد یعنی اوائل جون میں ہوگا۔
4. بیرونِ لاہور کے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ: مزید تفصیلات کے لیے قرآن کالج کا پراسپکٹس خط لکھ کر یا ٹیلیفون پر اپنا پتہ لکھوا کر طلب کر سکتے ہیں

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ فون نمبر: ۸۵۲۶۸۳ - ۸۵۲۶۱۱